چالیس منٹ کی عورت
(افسانے)
ڈاکٹر سلیم اختر

چالیس منٹ کی عورت

(افسانے)

ڈاکٹر سلیم اختر

سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

ترتیب

چالیس منٹ کی عورت

بیک وقت نیچے جھکنے سے ہم دونوں کے سر ٹکرا گئے اور ایک ہی سیفٹی بیلٹ ہمارے ہاتھ میں تھی۔ وہ زور سے ہنسی اور انگریزی میں کہا۔

''یہ تو بالکل کسی فلم کی مانند ہے۔''

''مگر عمر کے غلط دور میں.....'' میں نے جواب دیا۔

وہ دوبارہ ہنستی ہے اور تب ہمیں احساس ہوتا ہے کہ ابھی تک ہم دونوں اسی سیفٹی بیلٹ کو پکڑے تھے۔ اس مرتبہ پھر ہم دونوں نے سر جھکایا مگر یوں کہ سر ٹکرانے نہ پائیں۔

جواب میں میں نے سیفٹی بیلٹ چھوڑ دی اور سیٹ سے اٹھ کر دیکھا وہ میری بیلٹ پکڑے تھی اور اپنی پر براجمان۔ وہ اٹھ کر نیچے سے بیلٹ نکالتی ہے اور ساتھ ہی ہنستے ہوئے معذرت بھی کرتی ہے اس کے بعد سیٹ پر بیٹھ کر بیلٹ کسنے لگی تو معلوم ہوا کہ مزید کسے جانے کی گنجائش نہ رہی تھی۔ وہ میری طرف دیکھ کر ہنستی ہے اور بیلٹ دکھاتے ہوئے کہتی ہے۔ ''تمہاری یا میری'' اس نے انگریزی میں دریافت کیا۔ ''یقیناً کوئی موٹا مرد بیٹھا تھا جو بیلٹ اتنی کھلی ہے۔''

''موٹی عورت کیوں نہیں؟''

اس نے میری طرف پوری طرح مڑ کر مصنوعی غصے سے کہا۔ '' آخر موٹی عورت ہی کیوں۔ مرد کیوں نہیں؟'' اور ساتھ ہی ہنستی ہے۔

''اس لئے کہ........''

میں فقرہ مکمل کرنے کے بجائے اگلی سیٹ میں پھنسنے کی کوشش میں مصروف دو موٹی عورتوں کی طرف اشارہ کر دیتا ہوں۔ ہم دونوں انہیں دلچسپی سے دیکھتے ہیں۔ گہرے جامنی اور راجستھان کے مخصوص گہرے پیلے رنگ کی ساڑھیوں میں چمکتی سیاہ پیشانیوں پر سرخ بندیا خطرہ کے نشان کی مانند تھی۔ ان کی سانس پھولی تھی اور سردی کے باوجود وہ دونوں پسینہ پسینہ ہو رہی تھیں انہیں دیکھ کر وہ بچوں جیسی خوشی محسوس کرتی ہے اور منہ پر ہاتھ رکھ کر گویا ابلتے قہقہے کو حلق ہی میں دبا دیتی ہے' ہنسی روکنے سے اس کا چہرہ سرخ ہو جاتا ہے۔

''یقیناً تم سچے ہو۔''

وہ سیفٹی بیلٹ مختصر کرنے میں مصروف ہے لیکن وہی غلطی کر رہی ہے جو بالعموم کی جاتی ہے یعنی بک الٹا کر رکھا ہے۔

''لایئے میں ٹھیک کر دوں۔''

شکریے کے ساتھ وہ پیٹی میری طرف کر دیتی ہے' جو میں شرارتاً ذرا سی کم کر دیتا ہوں وہ اسے کمر پر رکھ کر دیکھتی ہے اور ہنستی ہے۔

''اب میں اتنی بھی موٹی نہیں۔''

''اتنی'' کہہ کر وہ دونوں موٹی عورتوں کی طرف اشارہ کر دیتی ہے۔ جو اب سیٹ میں پوری طرح دھنس چکی تھیں۔ اس کے بعد اس نے سانس روکی' پیٹ اندر کھینچا اور بیلٹ کس لی۔

میں ایک ادبی کانفرنس کے بعد دہلی سے لاہور آ رہا تھا۔ ایئر پورٹ کی زبردست چیکنگ نے سخت نروس کر رکھا تھا۔ اگرچہ میرے پاس کتابوں کے علاوہ اور کچھ بھی نہ تھا تاہم واکی ٹاکی لئے سیکورٹی گارڈز سے خواہ مخواہ خوف محسوس ہو رہا تھا۔ اس لئے جہاز میں داخل ہونے کے بعد بخیریت گھر پہنچنے جیسا احساس ہوا۔ تمام مسافر بیٹھ چکے تھے۔ سیفٹی بیلٹس باندھی جا چکی تھیں۔ دروازہ بند ہو چکا تھا۔ انجن کی گڑگڑاہٹ شروع ہو چکی تھی۔ جہاز پرواز کرنے کو تھا۔ میں گھڑی دیکھتا ہوں' پرواز میں تاخیر نہ ہوئی تھی اور اطمینان کی سانس لیتا ہوں کہ چالیس منٹ بعد میں لاہور میں ہوں گا۔ دہلی کی ادبی بھاگ دوڑ کے بعد پہلی مرتبہ اعصاب کو پرسکون پاتا ہوں۔

میں نہ تو باتونی ہوں اور نہ خواہ مخواہ کا سوشل اینمل' اس لئے ریل یا بس کے سفر میں منہ بند رکھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ مجھے نہ تو سفر کی دوستیاں مرغوب ہیں اور نہ ہی مسافروں کے ساتھ مل کر ملکی اور بین الاقوامی مسائل حل کرنے کا شوق ہے' ہوائی جہاز میں جتنے سفر کئے' آج تک کبھی کسی مسافر سے بات چیت کی نوبت نہ آئی چہ جائیکہ ایک عورت سے۔

میں باہر دیکھتا ہوں' رن وے پر جہاز کی دوڑ کا آغاز ہو چکا ہے اور پھر ٹیک آف!

ٹیک آف کا لمحہ بھی عجیب ہوتا ہے اکثریت کے لئے تشویشناک یا خوفناک' البتہ ایک محدود اقلیت' جن میں بچوں کی اکثریت شامل ہے' ٹیک آف سے لطف حاصل کرتی ہے۔ چنانچہ ایک بچی خوشی سے چیخی۔

''اڑ گیا!' اڑ گیا!''

عین اس وقت میں نے اپنے ہاتھ پر اس کی انگلیوں کا دباؤ محسوس کیا۔ میں چونک کر اسے دیکھتا ہوں۔ اس نے سر پیچھے کر رکھا تھا۔ جسم پر تناؤ' ناک کے نتھنے پھیلے ہوئے اور آنکھیں بند۔ وہ شاید کچھ ورد بھی کر رہی تھی۔ بالائی ہونٹ پر پسینے کے مہین قطرے ابھر آئے تھے۔

سچ تو یہ ہے کہ ٹیک آف سے میں بھی پر تناؤ ہو جاتا ہوں اگرچہ میں اریکا جونگ تو نہیں مگر مجھے بھی ''فیئر آف فلائنگ'' ہے۔ ایک تو یہ اس لئے کہ غریب پروفیسر ہوتے ہوئے امیرانہ مرض یعنی بلڈ پریشر کا مریض ہوں اور دوسرے اس لئے کہ اگرچہ زمین نے میرے لئے گلاب کے پھولوں کا بستر نہ بچھایا مگر پھر بھی یوں اچانک زمین سے قطع تعلق ہراساں کر دیتا ہے تاہم میں نارمل ہو جاتا ہوں مگر اب جو اس نے مارے ڈر کے میرا ہاتھ پکڑا' بلکہ جکڑا' یوں کہ اس کی سوکھی سوکھی انگلیاں ہاتھ میں کھب گئیں' اس کے خوف کی وجہ سے میں نے اپنا خوف زائل ہوتا محسوس کیا بلکہ خود کو ضرورت سے زیادہ نڈر بھی محسوس کیا۔

تمباکو نوشی ممنوع اور سیفٹی بیلٹ باندھنے کی ہدایات والی سرخ روشنیاں بجھ چکی ہیں' اب تک خاموش مسافروں نے گفتگو شروع کر دی ہے۔ سگریٹ سلگائے جا رہے ہیں۔

ایئر ہوسٹسوں نے اپنے معمولات کا آغاز کر دیا ہے۔ تب اسے بھی احساس ہوتا ہے کہ ٹیک آف ختم ہو چکا ہے اور وہ اب تک میرا ہاتھ جکڑے ہوئے ہے وہ ایک طویل سانس لیتی ہے اور گھبرا کر میرا ہاتھ چھوڑ دیتی ہے۔ میں انگلیاں کھول کر اور بند کر کے دوران خون بحال کرتا ہوں۔ وہ پرس میں سے ٹشو پیپر نکال کر پسینہ پونچھتی اور معذرت کرتی ہے۔

''کیوں کیا ہوا؟''

''وہ ......میں......وہ میں نے ہاتھ جو پکڑ رکھا تھا۔''

''اچھا؟'' میں انجان بننے کی اداکاری کرتا ہوں۔ ''وہ تو میں نے آپ کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا مجھے ڈر جو لگ رہا تھا۔''

وہ ہنستی ہے۔ ''یوناٹی بوائے۔''

''نو میڈم میں ناٹی تو ہو سکتا ہوں مگر بوائے ہرگز نہیں' اس لئے ناٹی اولڈ مین زیادہ مناسب رہے گا۔''

میں سر کے سفید بالوں میں مبالغہ آمیز انداز میں انگلیاں پھیرتا ہوں۔ وہ قہقہہ لگاتی ہے' ساتھ ہی پرس کھول کر سگریٹ پیش کرتی ہے۔ میں انکار کرتا ہوں۔ اس کی بھوں سوالیہ انداز میں اٹھتی ہے۔

''میں سگریٹ نہیں پیتا''

''کمال ہے!''

''اللہ تعالیٰ نے دو چیزوں سے وقت پر بچا لیا ایک شاعری اور دوسری سگریٹ نوشی۔''

وہ ہنس کر سگریٹ کا پیکٹ پرس میں رکھ لیتی ہے. میں پوچھتا ہوں۔ ''سگریٹ کیوں نہیں پیا؟''

''میں تو نہیں پیتی؟''

''تو یہ پیکٹ......''

''یہ تو یوں ہی پرس میں پڑا رہتا ہو۔ بعض اوقات کسی دوست کو ضرورت پڑے تو اسے پیش کر دیتی ہوں۔''

بلحاظ زبان عورتیں دو قسم کی ہوتی ہیں ایک تو منہ بند سیپی اور دوسری پرشور آبشار۔ یقیناً یہ ثانی الذکر تھی کہ ہم دونوں یوں محو کلام تھے گویا عمر بھر یہی کام کیا ہو لیکن ٹھہریئے' اسے انٹرنیشنل رومانس میں تبدیل کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں پچپن برس کا ہوں سر کے بال کیوں کہ دھوپ میں سفید ہوئے اس لئے ان کا عقل سے بھی کوئی تعلق نہیں۔ ادھر یہ بھی پچاس سے کم نہ ہوگی۔ سانولا رنگ' پتلا چہرہ' باریک لب اور تیز متحرک آنکھیں' باریک نوکیلی ٹھوڑی' سفید ساڑھی میں ملبوس' تیز لہجہ اور کچھ کچھ اردو بلکہ پنجابی میڈیم کے چھکے چھڑا دینے والی کنگز انگلش' اس نے سوکھی مگر پھرتیلی انگلیوں سے پرس میں سے رنگین ریشمی تھیلی نکالی اور سپاری' کتھا اور چونا نکال کر ایک پان بنا کر میری طرف بڑھایا میں نے انکار کرتے ہوئے ایک الائچی منہ میں رکھ لی اور ساتھ ہی کہا۔

''اس انگریزی کے ساتھ یہ پان......؟''

بولی ''پان کا انگریزی سے کوئی تعلق نہیں میں تو پیٹ بھرنے کو پان کھا رہی ہوں۔''

''کیا مطلب؟''

''مجھے سخت بھوک لگی ہے۔'' اس کے بعد مفصل داستان سنائی جس میں کچھ بچوں' بھانجیوں' بازاروں اور دو کانوں کے نام آتے تھے۔ ان سب کی وجہ سے اسے کھانا کھانے کا موقع نہ ملا اور افراتفری میں ایئرپورٹ پہنچی' ''سمجھے؟''......اس نے یوں پوچھا گویا مجھے داستان کا اخلاقی سبق سمجھا رہی ہو۔ ''تو پان کھانا ہونٹ سرخ کرنے کو نہیں ہے بلکہ پیٹ بھرنے کے لئے ہے۔''

''کوئی بات نہیں۔'' میں نے دلاسا دیا۔ ''ابھی کھانے کے لئے کچھ مل جائے گا۔''

وہ تیوری چڑھا کر بولی۔ ''یہ کیا کھانے کو دیں گے' ایک سوکھا سڑا سینڈوچ اور گتے کے گلاسوں میں چلو بھر نیم گرم کولڈ ڈرنک۔''

اتنے میں قریب سے ایئر ہوسٹس گزری اسے دیکھ کر زور زور سے ہنسنے لگی' میں نے وجہ پوچھی' بولی۔

"مجھے اتنی بھوک لگی ہے کہ میں اس ایئر ہوسٹس کو بھی کھا سکتی ہوں۔"

میں نے عرض کیا" ذاتی طور پر مجھے کوئی اعتراض نہیں بشرطیکہ اس کے ماتھے کی تیوریاں ہضم ہو جائیں۔"

اتنے میں وہ دوبارہ پاس سے گزری تو اسے متوجہ کر کے کہنے لگی۔" بھئی تم مسکراتی کیوں نہیں' اچھی خاصی صورت ہے اگر مسکراتی رہو تو اور بھی اچھی لگو۔"

میرا قہقہہ نکل گیا اور وہ جھینپ کر چلی گئی' یہ میری طرف دیکھ کر کہنے لگی۔" یہ جھینپتی ہوئی بھی اچھی لگتی ہے۔" اور ساتھ ہی خوشی کا نعرہ لگایا۔ دوسری جانب بیٹھی عورت نے اسے مشکوک نظروں سے دیکھا مگر یہ سب سے لاتعلق تھی۔ کھانے کی ٹرے لئے ایئر ہوسٹس ادھر ہی آ رہی تھی' وہ نہیں دوسری۔

"آپ نے اسے بھگا دیا۔"

وہ خوش ہو کر بولی" کہو تو اسے بھی بھگا دوں۔"

"نہ ایسا نہ کیجئے۔ بے چاری بھاگ کر باہر کہاں جائے گی؟"

ٹرے سامنے آئی تو میری طرف ان نظروں سے دیکھا گویا کہہ رہی ہو میں نہ کہتی تھی' ٹرے میں واقعی ایک سینڈوچ اور ایک پیسٹری سج رہی تھی جسے اس نے صحیح معنوں میں ہڑپ کر لیا اور پھر جیسے روہانسی ہو کر بولی۔" اب کیا کروں؟"

میں نے اپنا سینڈوچ اور پیسٹری پیش کر دی' جنہیں اس نے شکریہ ادا کئے بغیر کھانا شروع کر دیا۔

"کچھ سہارا ہوا؟"

دوٹوک لہجے میں بولی" نہیں۔"

"یوں کرتے ہیں ایک ٹرے اور مانگ لیتے ہیں۔"

"وہ تو خیر مانگیں گے ہی بلکہ ہم دونوں مانگیں گے مگر......." اس نے فقرہ ادھورا چھوڑ کر مجھے کہنی ماری۔

"سامنے دیکھو۔"

دونوں موٹی عورتیں اپنی اپنی ٹرے لئے گم صم بیٹھی تھیں۔

"کچھ سمجھے؟"

میری طرف جھک کر کان میں سرگوشی کی۔" یہ ہندو ہیں تو بھلا چکن سینڈوچ کیسے کھا سکتی ہیں۔"

"اب تو سب ہندو کم از کم چکن تو کھا لیتے ہیں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دہلی کے جس ریستوران نے یہ سپلائی کئے ہیں وہ شاید ہندو کا ہو۔"

"ایسی باریک باتوں سے انہیں کیا لینا۔ میں ان سے مانگ لیتی ہوں۔"

اور ابھی میرے منہ سے" ہائیں! یہ آپ کیا کر رہی ہیں" نکلا بھی نہ تھا کہ اس نے انہیں اپنی جانب متوجہ کیا اور کہا۔" اگر آپ کو یہ پسند نہیں' تو آپ مجھے دے دیں' میں کھا لوں گی' مجھے بہت بھوک لگی ہے۔"

دونوں عورتوں کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ انہوں نے سوچا ہوگا شاید یہ مذاق کر رہی ہے مگر یہ تینوں اس قسم کے مذاق کی عمر سے نکل چکی تھیں۔ انہیں گومگو کے عالم میں دیکھ کر چہکی۔

"میں سنجیدہ ہوں۔"

انہوں نے گھبرا کر کھانے کی ٹرے سے سینڈوچز اٹھا کر اسے تھما دیئے۔ اس نے بچوں جیسی کلکاری ماری اور ایک سینڈوچ پر منہ مارا' سامنے والی موٹیاں سر جوڑے کھسر پھسر کر رہی تھیں۔ پھر ان کی دبی دبی ہنسی گونجی مگر یہ کھانے میں جتی تھی۔ اس کے بعد اچانک میری طرف متوجہ ہو کر کہنے لگی۔

"اوہ مجھے یاد آیا' میں نے تمہارا سینڈوچ لیا تھا چاہو تو اپنا قرض واپس لے سکتے ہو۔"

"جی نہیں شکریہ!"

اگلی سیٹ پر سے ایک موٹی گردن ذرا سی ٹیڑھی ہوئی' مگر جب اسے کھانے میں منہمک پایا تو گویا اطمینان ہو گیا۔

"اور منگوا لیں؟"

"بس! لوگ کیا کہیں گے۔" اس نے آنکھ مارتے ہوئے معنی خیز انداز میں اگلی

سیٹ والیوں کی طرف اشارہ کیا۔ اس نے ایک مرتبہ پھر پرس کھولا۔ ٹشو پیپر نکالا' منہ پونچھا' آنکھوں میں کاجل ڈالا' چہرے پر پف مارا اور ہونٹوں پر لپ اسٹک لگائی' پھر بڑے اہتمام سے پان بنا کر منہ میں رکھا اور اطمینان کی ایک طویل سانس لے کر بولی۔

''اب میں خود کو انسان محسوس کرتی ہوں۔''

وہ کچھ دیر تک ارد گرد کے مسافروں کا جائزہ لیتی رہی پھر بولی۔ ''میں ہی بولے جارہی ہوں اب تک تمہارے بارے میں تو کچھ پوچھا ہی نہیں۔''

میں مختصراً بتاتا ہوں۔ نام' کالج' تنقید نگاری اور یہ کہ غالب سیمینار میں شرکت کے بعد دہلی سے لوٹ رہا ہوں۔

''غالب سیمینار؟'' وہ خوش ہو کر بولی۔ ''مجھے غالب کے بہت سے اشعار یاد ہیں۔''

''اچھا؟''

''غالب کا ایک پسندیدہ شعر سناؤں۔''

''ارشاد''

''باغ پا کر خفقانی یہ ڈراتا ہے مجھے
سایۂ شاخِ گل افعی نظر آتا ہے مجھے''

میں حیرت زدہ اسے دیکھتا ہوں۔ فر فر انگریزی بولنے والی نے نہایت شستہ لہجے میں شعر پڑھا تھا اور بڑی بات یہ کہ یہ شعر غالب کے عام اور عوام پسند اشعار میں سے نہیں ہے۔ اس شعر کا عجب ہانٹڈ سا اثر ہوتا ہے اور بحیثیت استاد میرے تجربے کے مطابق یہ ان اشعار میں سے ہے جن کا اثر تو خود پر وارد کیا جاسکتا ہے مگر روایتی طریقے پر طلبہ کو تشریح نہیں سمجھائی جاسکتی۔

میری حیرت سے لطف لیتے ہوئے اس نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور کہنے لگی۔ ''ہمارے گھر کا ماحول اردو کا ہے یہ تو میں تھی جو انگریزی کی جانب نکل گئی۔''

''کیوں؟''

اس کے چہرے پر سے جیسے دھواں گزر گیا۔ نظریں جھک گئیں اور گویا خود میں گم

ہوگئی پھر طویل سانس لے کر میری طرف دیکھا' نظروں میں عجب کیفیت تھی۔ آگ یا راکھ؟ ہونٹوں پر زبان پھیری' کچھ کہنے کو منہ کھولا مگر پھر ہونٹ بھینچ لئے۔ نہ جانے میرے بے ضرر سے سوال نے اسے ماضی میں کہاں پہنچا دیا تھا۔ میں شرمندہ تھا' وہ خاموش...... پھر اچانک بولی ''کیا فرق پڑتا ہے۔''

''کیا؟'' میں نے چونک کر دیکھا۔

اب وہ اردو میں بولی' لہجے میں عجب ٹھہراؤ تھا۔ جیسے وہ ابھرتے جذبات اور اٹدتے ہیجانات کو دبا رہی ہو۔ ''دراصل انگریزی ان کے لئے تھی۔''

''اوہ!''

''وہ آکسفورڈ سے پڑھ کر آیا تھا۔'' اس کی آنکھیں جیسے ماضی میں کھلی تھیں۔ ''وہ بے حد خوبصورت' بے حد جاذب نظر اور بے حد جامہ زیب تھا۔ لمبا قد' سفید رنگ' اسٹیج ایکٹروں جیسی گھمبیر آواز۔'' وہ ایک لمحے کو جیسے جھجک کر خاموش ہوگئی۔ اب چہرے پر رنگوں کی جوالا تھی پھر جو بولی تو آواز میں ستار پر ٹوٹتے سُر کی لرزش تھی۔ ''میں اس کے مقابلے میں بہت زیادہ احساس کمتری میں مبتلا تھی۔ اس لئے انگریزی بولنی شروع کی....... میں...... میں نے اس کے تمام مشاغل اپنا لئے تاکہ میری وجہ سے دوستوں میں کبھی شرمندگی نہ ہو.....''

اس نے سر جھکا لیا' میں خاموش رہا۔ پھر بولی۔

''ہماری زندگی مثالی تھی' میں جانتی ہوں کہ میں خوبصورت نہیں ہوں۔ محض ایک عام عورت اور اس کے سامنے تو میں ویسے بھی کچھ نہ تھی' لیکن اس نے مجھے پھول کی مانند رکھا گل دان کے پھول کی مانند نہیں جس کا پانی تبدیل کرنا بھول جاتے ہیں بلکہ وہ پھول جو مرد کے کوٹ کے کالر میں سجتا ہے۔ میں خود کو دنیا کی خوش قسمت ترین عورتوں میں شمار کرتی تھی اور پھر......''

''پھر؟''

''وہ مر گیا!''

''مر گیا؟ مگر کیسے؟''

"کار کے حادثے میں، میں بدقسمت بچ گئی اور اور وہ جو زندگی کی گرمی اور حرکت سے بھرپور تھا مر گیا۔ آخری الفاظ جو اس کے منہ سے نکلے میرا نام تھا۔"

اس کی آواز رندھ گئی آنکھیں بھیگ گئیں، میں بھی آزردہ سا ہو گیا۔ اتنی خوش مزاج خاتون اتنی دکھی بھی ہو سکتی ہے، یہ تو میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ وہ میری طرف مڑ کر بولی۔

"معذرت! میں نے اپنی بپتا سے تمہیں آزردہ کر دیا۔"

"معذرت کی ضرورت نہیں۔ میں تو صرف یہ سوچ رہا ہوں کہ ہر انسان اپنے وجود میں ایک جزیرے کی مانند ہوتا ہے۔ پہلی نگاہ میں کچھ، باہر سے کچھ اور اندر سے اور ہی کچھ۔"

"صحیح ہے۔"

جہاز میں ایئر ہوسٹس لاہور پہنچنے کا اعلان کر رہی تھی۔ لینڈنگ کے لئے جہاز قوس بنا رہا تھا۔ اس نے جیسے کندھے جھٹک کر ماضی کو جھٹکا اب وہ پہلے والی خوش مزاج عورت تھی۔ مجھ سے انگریزی میں پوچھا۔

"تم تو لاہور میں اترو گے؟"

"ہاں۔"

"میں اسلام آباد جاؤں گی۔"

جہاز نے لینڈ کیا۔ مسافر سامان سمیٹ رہے تھے۔ ہم بھی کھڑے ہو گئے وہ ہاتھ ملا کر بولی۔

"تم بہت سویٹ ہو، تمہارے ساتھ سفر بہت پرلطف گزرا۔"

"شکریہ...... مگر چلتے چلتے ایک بات تو بتا دیں۔"

"کیا؟"

"پھر دوسری شادی کی یا نہیں۔"

وہ جیسے برا مان کر بولی۔ "اس شیر کے بعد شوہر بننے والا ہر مرد مجھے چوہا لگتا۔" اور اس تشبیہہ پر خود ہی زور سے ہنسی۔ دونوں موتیوں کا شکریہ ادا کیا۔

"خدا حافظ"

"خدا حافظ"

طیارے کے گیٹ پر مسکراہٹ نا آشنا ایئر ہوسٹس میکانکی انداز میں مسافروں کو خدا حافظ کہہ رہی تھی۔ یہ چلتی چلتی اس کے پاس رکی اور نہ جانے اس کے کان میں کیا کہا کہ وہ سچ مچ مسکرا دی اور مسکراتے ہوئے وہ واقعی اچھی لگی۔

کئی ماہ بعد اسلام آباد کے ایک ریستوران میں اسے دیکھا تو خوشی سے لپکا۔ ہماری آنکھیں چار ہوئیں تو اس کی آنکھوں میں ایسی لاتعلقی اور بے اعتنائی تھی کہ مسکراہٹ میرے ہونٹوں پر منجمد ہو گئی اور قدم رک گئے، میں مڑنے کو تھا کہ اس کے ساتھ اپنا دوست اکبر اور اس کی بیوی جسے میں اکبر کی رعایت سے اکبری کہتا تھا، بیٹھے نظر آ گئے۔ انہوں نے بھی مجھے دیکھ لیا تھا۔ اکبر جلدی سے اٹھا اور اپنی میز پر لے آیا۔

"تم یہاں کہاں؟"

میں نے بتایا کہ کام سے آیا ہوں۔ اکبری بیوی بچوں کا حال دریافت کرنے لگی۔

میں نے دزدیدہ نظروں سے دیکھا تو محسوس ہوا کہ عورت نہیں پتھر کی مورت ہے۔ چہرہ سپاٹ، آنکھیں جھپکائے بغیر نہ جانے کہاں دیکھ رہی تھی۔ لب سختی سے اندر کو بھینچے ہوئے ظاہر ہے کہ اس رویہ پر میں ہوائی جہاز کی چالیس منٹ کی ملاقات کو تجدید تعلقات کا کیسے ذریعہ بنا سکتا تھا، چنانچہ میں نے جل کر اخلاقاً یہ بھی نہ پوچھا کہ یہ محترمہ کون ہیں حتی کہ ادھر اُدھر کی باتوں کے بعد اکبری کو خود ہی خیال آیا۔

"سلیم بھائی! یہ میری آپا ہیں۔"

میرے سلام کے جواب میں اس نے گویا مکھی اڑا دی ہو۔ میں نے سوچا ہو سکتا ہے یہ وہ نہ ہو بلکہ اس سے مشابہہ کوئی اور ہی ہو۔ بولتی تو آواز سے کچھ اندازہ ہو جاتا، اگرچہ میں ان کے ساتھ اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا مگر ذہن میں کھچڑی پکتی رہی اور اس کے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکلا۔ تھوڑی دیر بعد وہ اٹھ کر باتھ روم گئی تو میں نے پوچھا۔

"یہ کون سی آپا ہیں؟"

"گونگی آپا۔" اکبر فوراً بولا۔

اکبری نے برا ماننے والی نظروں سے اسے دیکھا۔ اکبر کہنے لگا۔ "یہ درست ہے

یہ اتنی کم گو ہیں کہ سب انہیں گونگی آپا کہتے ہیں۔"

"کیوں؟"

"ساری عمر شادی نہ ہو سکی۔" اکبری افسردگی سے بولی۔ "بس بجھ کے رہ گئی بے چاری۔"

اکبر کہنے لگا۔ "کئی کئی دن گزر جاتے ہیں ان کی آواز سنے' نہ کسی سے ملنا' نہ کہیں آنا نہ جانا۔ بس اپنے آپ میں گم چپ چاپ۔"

"انہیں میں نے پہلے تو تمہارے گھر میں نہیں دیکھا۔"

"یہ دہلی میں ہوتی ہیں۔"

وہ آ رہی تھی میں نے کہا۔ "اچھا میں چلتا ہوں۔"

اکبری بولی۔ "چائے پیتے جائیے۔"

"پھر کبھی...... میں ذرا جلدی میں ہوں۔ خدا حافظ۔"

میں اور گونگی آپا ایک دوسرے کے پاس سے اجنبیوں کی مانند گزر جاتے ہیں۔

O.....O.....O

ہری ہری گھاس

گامے نے سوہنی کی جلد پر ہاتھ پھیرا تو مانوس چکناہٹ سے اعصاب میں پھریری سی دوڑ گئی۔ ہر صبح وہ بڑے اہتمام سے اس کی سیوا کرتا۔ کھرکھرا لے کر رگڑتا رہتا' حتیٰ کہ سرمئی جلد چمکنے لگتی۔ پانی والی ناند اور گھاس کا گٹھا سامنے رکھ کر مارے اشتیاق کے اسے دیکھتا رہتا اور ساتھ ہی ناشتہ بھی کرتا جاتا۔ ناشتہ کیا تھا۔ تندور سے گرما گرم دو کلچے لئے' کھوکھے سے چائے کا پیالہ بھرا اور بس ناشتہ تیار۔ دراصل یہی وہ وقت تھا جب وہ دونوں گویا ذہنی لحاظ سے فارغ ہوتے اور دو گہرے دوستوں کی مانند گفتگو کرتے۔ یعنی وہ باتیں کرتا اور سوہنی سنتی' کبھی کبھی وہ جب زیادہ جوش میں آ کر کسی بات پر زور دینے کو نسبتاً زور سے بولتا تو وہ چونک کر اسے دیکھنے لگتی اور گویا ہاں میں ہاں ملانے کو سر ہلا دیتی ایسے میں گلے پڑا گھنگھروؤں کا ہار جھنجھنا اٹھتا۔ بعض اوقات سوہنی اور اس کی آنکھیں چار ہوتیں تو محسوس ہوتا کہ وہ بھی کچھ بتانے کی' کچھ سمجھانے کی کوشش کر رہی ہے' اس کے دونوں کانوں کی نوکیں آگے ہو جاتیں اور نتھنے پھڑکنے لگتے۔ بعض اوقات وہ زیادہ ہیجانی کیفیت میں ہوتا تو وہ اس کی حالت سمجھتے ہوئے گویا بے چینی سے کھر فرش پر مارنے لگتی۔

دونوں کو صبح کے عافیت کے ان لمحات کی قدر و قیمت کا احساس تھا۔ اس لئے دونوں ان سے حظ حاصل کرنے کے لئے گویا شعوری طور پر انہیں طویل کرتے جاتے' نہ وہ تیزی سے گھاس ہڑپ کرتی اور نہ وہ جلدی جلدی کلچہ نگلتا۔ وہ اطمینان سے منہ چلاتی رہتی اور وہ کلچہ کا ایک ایک نوالہ یوں چبائے جاتا گویا جگالی کر رہا ہو' منہ چلتے چلتے دونوں کی نگاہیں

چار ہو جاتیں تو چلتے منہ یوں رک جاتے گویا کسی خیال نے اچانک چونکا دیا ہو' ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانکتے اور پھر اطمینان سے منہ چلانے لگتے...... تب اچانک گامے کو یاد آتا کہ وقت نکلا جا رہا ہے' اسکول کے بچے لینے میں ذرا بھی تاخیر ہوگئی تو ماں باپ بولنے لگیں گے۔ چائے کا آخری گھونٹ بھر کر کہتا۔

''چل سوہنی چل' بہت گپ شپ ہوگئی!''

زیادہ موج میں آتا تو لہک کر بولتا۔

''کیوں سرکار چلیں؟''

اور جب زیادہ اتراتا۔ ''ڈارلنگ سوہنی! اجازت ہے نا؟''

گامے کی تنہا زندگی کی سنگی صرف یہ سوہنی ہی تھی۔ روزی کا ذریعہ کم اور دوست زیادہ' اس نے اسے کبھی جانور نہ سمجھا تھا وہ ایسی ہمدرد ساتھی تھی جس سے دکھ سکھ کی بات کی جا سکتی تھی۔ اڈہ پر کھڑے یاروں سے اس بات پر ہمیشہ تکرار رہتی تھی کہ وہ تانگہ میں زیادہ سواریاں کیوں لادتے ہیں۔ گھاس سوکھی کیوں ڈالتے ہیں' گندگی پسند کیوں ہیں اور ان سب سے بڑھ کر یہ کہ مارتے کیوں ہیں؟

وہ زیادہ سواریاں' سوکھی گھاس کم دانہ کی وجہ تو سمجھ سکتا تھا لیکن چابک اس کے لئے ناقابل قبول تھا۔ خدمت کے عوض محبت ملنی چاہئے۔ نہ کہ چابک۔

چابک تو اس کے پاس بھی تھا۔ رنگین پھندنوں والا چمکیلا لیکن یہ صرف سجاوٹ کے لئے تھا۔ یوں بھی چابک کے بغیر کوچوان مکمل نہیں ہوتا۔ اس لئے تانگہ کے ساتھ چابک بھی تھا مگر اس نے آج تک اسے استعمال نہ کیا۔ سوہنی کی خوبصورت' ملائم اور چمکیلی' سرمئی جلد پر چابک...... گاما تو اسکا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ ویسے بھی سوہنی اس کے اشاروں پر چلتی تھی۔ لہٰذا وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ کیسے ان بے زبانوں کی کمر پر چابک توڑا جا سکتا ہے۔ اسی لئے جب ایک کوچوان کو بری طرح سے اپنی گھوڑی کو پیٹتے دیکھا تو گامے سے نہ رہا گیا اور اپنی سواریوں کے منع کرنے کے باوجود طیش میں آ کر اس سے لڑنا شروع کر دیا۔

جو پہلے تو حیران ہوا پھر گامے سے لڑنے لگ گیا اور گاما تھا کہ بار بار کہے جا رہا تھا۔

''ظالم! تو اگر اس کی جگہ جتا ہوتا تو پھر...... سوچ کیسے تکلیف ہوتی۔''

دونوں کی خوب لڑائی ہوئی۔

گامے نے اس کا چابک چھین کر شڑاپ شڑاپ کرتی آواز میں دو تین جڑ دیئے۔

دن بھر سڑکوں کی دھول پھانکنے' اچھی بری سواریوں سے مغز ماری اور موسم کی مار سہنے کے بعد وہ جب واپس آتا تو گلی کے نل سے پانی بھر کر لاتا' سوہنی کو نہلاتا' نرم کپڑے سے جلد خشک کرتا' تیل مالش کرتا اور پھر کپڑا رگڑ رگڑ کر سرمئی جلد چمکا دیتا یوں کہ سوہنی لشکارے مارنے لگتی۔ اس کے بعد ذرا فاصلہ سے اس کا جلوہ دیکھتا' اس مصور کی مانند جو کینوس مکمل ہونے کے بعد اپنی محنت سراہتا ہے اور تب طمانیت اور فخر کی مسکراہٹ چہرہ کو روشن کر دیتی' تھکن دور ہو جاتی اور اسے زندگی قابل قدر محسوس ہوتی!

سوہنی اس کی زندگی کا محور بن چکی تھی اور شہر کی لمبی سڑکیں مدار۔ وہ تنہا تھا۔ ماں باپ مر چکے تھے اور کوئی بھائی بہن بھی نہ تھی بس یہ چھوٹا سا کچا پکا گھر' تانگہ اور سوہنی۔ وہ اس زندگی سے اتنا مطمئن تھا کہ اس نے بطور خاص شادی کا بھی نہ سوچا۔ حالانکہ محلّہ کی ایک دو کنواریاں اس کی سوہنی کو اور ایک بیوہ اسے خاص قسم کی نظروں سے بھی دیکھتی تھی مگر وہ محض گاما تھا اور عورتوں کی نظروں کی زبان کے معاملہ میں چٹا ان پڑھ!

کبھی کبھی یوں بھی ہوتا۔ برسات کی راتوں میں بادل کی کڑک یا بجلی کا لہریا جیسے دل میں خوف بھر دیتا تو اپنی چارپائی سوہنی کے قریب کر لیتا۔ وہ آنکھیں کھول کر اسے دیکھتی اور جیسے اس کے ڈر کو سمجھ کر تسلی دینے کو ذرا سے گھنگھرو چھنکا دیتی' قربت کے اس احساس سے ڈر دور ہو جاتا۔

ایک رات بہت ٹھنڈ لگی' رات اتنی سرد تو نہ تھی نہ جانے اچانک کپکپی کیوں چڑھ گئی۔ سوچا شاید کوئی کھڑکی کھلی رہ گئی ہو' مگر نہیں' روشن دان تک بند تھے۔ منہ رضائی میں دے دیا۔ گیند بن گیا۔ یوں کہ دل کی دھڑکن گھٹنوں میں اترنے لگی مگر کپکپی ختم نہ ہوئی' اچانک اٹھا اور سوہنی کے گرم پنڈے سے جا لپٹا اس نے ہڑبڑا کر گامے کو دیکھا اور گویا اس کی حالت سمجھ گئی اور تھوتھنی اس کے ساتھ رگڑنے لگی۔ آہستہ آہستہ گامے کی کپکپی تھم گئی اور اس کی جگہ گرمی کا احساس لیتا گیا...... اور پھر گرمی...... شدید گرمی اور پسینہ سے شرابور جسم! ادھر سوہنی کے نتھنوں سے بھاپ کے فوارے چھوٹ رہے تھے۔

ویسے بحیثیت مجموعی زندگی بری نہ تھی۔ صبح بچوں کو اسکول لے جانے سے شروع ہوتی وہ دیگر تانگہ والوں کی مانند بچے آلوؤں کی بوری میں بند کرنے کی مانند تانگہ میں نہ ٹھونستا کہ دس بیچ میں ٹھسے بیٹھے ہیں' چار پیچھے ٹانگیں لٹکائے' پائیدان پر ایک ایک سجا بیٹھا' اور دو بم سے لٹکے جھولتے۔ اس کے پاس تو اچھے گھرانوں کے چار پانچ بچے تھے جو صاف ستھرے کپڑے پہنتے' تمیز سے بیٹھتے' نہ آپس میں لڑتے اور نہ سوہنی کی دم مروڑتے۔

اسکول کے بعد وہ دوپہر تک آزاد ہوتا۔ پھر بچے گھروں کو پہنچائے اور پھر اگلی صبح تک کے لئے آزاد...... اب یہ سواریاں اور راستوں پر موقوف تھا کہ وہ شام کو گھر پہنچتا ہے یا رات گئے۔ اس نے زیادہ کمائی کی خاطر کبھی سوہنی کو ناجائز تکلیف دینے کی کوشش نہ کی تھی۔ اس لئے بعض اوقات غیر متوقع طور پر تھوڑے وقت میں زیادہ کمائی کر لیتا تو پھر عیاشی کے لئے فلم دیکھتا۔ انجمن اور سلطان راہی کی' دودھ جلیبیاں پیتا' تندور کی بجائے ہوٹل میں اپنی دعوت کرتا' بحیثیت مجموعی وہ اپنے آپ سے خوش تھا اور اس شہر سے بھی'...... حتیٰ کہ پولیس کے سپاہیوں سے بھی جو چند روپے لے کر غلطی معاف کر دیتے اور چالان نہ کرتے۔

آج صبح سے ہلکی مگر مسلسل بارش ہو رہی تھی۔ اگرچہ سکول سے بچے لینے میں اسے کچھ دیر ہو گئی تھی مگر کیچڑ' گڑھوں' پانی اور ٹریفک کی وجہ سے وہ محتاط طریقہ سے تانگہ چلا رہا تھا' سکول پہنچ کر بچے لئے اور تانگہ موڑنے کو تھا کہ نگاہ اس پر پڑی۔ وہ اسکول کے دروازے کے ساتھ بس اسٹاپ کے ٹوٹے سائبان کے نیچے کھڑی تھی۔ کچھ بھیگی کچھ خشک' سفید چادر کی بکل میں سے صندلی پیشانی جیسے لو دے رہی ہو' دونوں ہاتھ ڈھیلے چھوڑے یوں کھڑی کہ اگر سہارا نہ ملا تو گر جائے گی۔ مڑتے تانگہ سے بننے والی قوس کے مختصر ترین لمحہ میں گامے نے بہت کچھ دیکھ لیا تھا۔ وہ اکثر مسوں کو پہچانتا تھا مگر اس نے اب تک اسے نہ دیکھا تھا غالباً یہ نئی تھی اور یقیناً نویلی بھی!

چھٹی ملنے کی خوشی میں شور مچاتے' ہنستے' لڑتے جھگڑتے' بچے تانگہ میں لد رہے تھے۔ بستے دھما دھم پھینکے جا رہے تھے۔

عام طور پر گامے کی بچوں سے گپ شپ ہوتی تھی مگر اب زبان اور کان بند تھے۔ صرف آنکھیں کلام کر رہی تھیں۔ اس نے ایک لمحہ کو جھکی آنکھیں اٹھائیں تو گامے کو اپنی ہی

طرف دیکھتے پایا۔ وہ اگر تانگہ سے نیچے نہ گر پڑا تو یہ باعث تعجب تھا۔

بچے خوشی سے چلا رہے تھے۔

''مِس''

''مِس ادھر آ رہی ہیں۔''

''مِس! ہمارے تانگہ میں بیٹھئے۔''

''پلیز مِس!''

''مِس میرے ساتھ والی سیٹ پر آ جایئے۔''

''ادھر آیئے مِس!''

وہ پھوار میں کھڑی سوالیہ نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ گامے نے تھوک کا گولہ نگلا' حلق تر کیا مگر پھر بھی نہ بول سکا' اس نے آگے بیٹھے دو لڑکوں کو پیچھے کیا اور وہ خاموشی سے تانگہ میں جیسے سمٹ کر بیٹھ گئی' اس تمام عمل کے دوران سوہنی خاموش اور ساکت رہی کہ اسے چلنے کا اشارہ نہ ملا تھا۔ سوہنی بہت سمجھدار تھی جب تک بچے تانگہ میں لدتے رہتے وہ اپنی جگہ سے نہ ہلتی جب بچے بیٹھ جاتے تو پھر یہ کہتا۔

''چل سوہنے چل۔''

فوراً حرکت کرتی' مگر آج تو گاما گم تھا۔ سوہنی نے ایک دو مرتبہ بے چینی سے سر ہلا کر گلے کے گھنگھرو بجائے' تب وہ چونکا' باگیں اٹھا دیں اور سوہنی چل دی۔ بچے بہت خوش تھے کہ ان کی مِس ساتھ جا رہی تھی اور یہ ایک بڑا اور اہم واقعہ تھا۔ گامے نے بہانہ بہانہ سے اس کی طرف دیکھا۔ بھیگے بازو پر مہین مہین اور نرم نرم بال چپک رہے تھے' گیلا ہو کر نمک اور بھی نکھر گیا تھا۔ وہ بڑے انہماک سے سامنے سڑک کو دیکھ رہی تھی۔ بھاری پپوٹوں کے نیچے موٹی موٹی آنکھیں جیسے نیند کی دھند سے طلوع ہو رہی ہوں' اس نے ایک دو مرتبہ آنکھیں جھپک کر گامے کی طرف دیکھا تو اس کے ہاتھ سے باگ چھٹ گئی' وہ بولی۔

''آج بس آئی نہیں اور بارش بھی تھی' ادھر مجھے دیر ہو رہی تھی اس لئے......''

''کوئی بات نہیں'' وہ بولا۔ ''جہاں کہیں گی چھوڑ آؤں گا۔''

''ہاں مِس'' پیچھے سے بچوں کی آواز کا کورس ابھرا۔ ''آپ اب ہمارے ساتھ ہی چلئے۔''

"آپ روز ہمارے ساتھ چلا کریں۔"

"کیوں تانگے والے؟"

"مجھے بھلا کیا اعتراض ہو سکتا ہے جی۔"

وہ ہنسی۔ "خیر یہ تو بعد کی بات ہے۔" اس نے چادر ٹھیک سے اوڑھتے ہوئے کہا۔ "ابھی تو گھر پہنچیں۔"

"وہ تو جی سوہنی آپ کو سیکنڈوں میں پہنچا دے گی۔"

"سوہنی۔"

"اس کی گھوڑی کا نام ہے۔" بچوں نے اسے مطلع کیا۔

"اچھا" وہ زور سے ہنسی تو سفید دانت چمکے۔

سوہنی کو پر لگ گئے تھے کہ بریک' گاما کچھ سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ راستہ سمٹ رہا تھا کہ پھیل رہا تھا۔ وہ سمجھنے سے قاصر تھا۔ ایک ایک کر کے بچے اترتے جا رہے تھے۔

اب تانگہ میں دونوں تنہا تھے' خاموش راستہ کیچڑ بھرا تھا کہ بارش پھولوں کی ہوئی تھی...... کچھ کہا نہیں جا سکتا تھا۔ وہ اپنے گھر کا پتہ سمجھا رہی تھی جو خاصے فاصلے پر تھا...... کاش وہ یہ کہتی مجھے گوجرانوالہ لے چلو' مجھے گجرات لے جاؤ' اس کے برعکس وہ تو یہ کہہ رہی تھی۔

"مجھے ضروری کام سے واپس بھی جانا ہے۔ اگر تم رک جاؤ...... بلکہ یوں کرو کہ آج سارا دن ہمارے ساتھ ہی رہو۔"

وہ کیچڑ بھری گلی میں یوں سنبھل سنبھل کر چل رہی تھی' جیسے سوہنی سر پر گھڑا رکھے جا رہی ہو۔ اس نے سوہنی کو دیکھا۔

"سوہنیو! کچھ کھاؤ گے؟"

گھاس کا گٹھا نکال کر اس کے سامنے ڈال دیا اور خود سیٹ پر بیٹھ گیا۔ کتنی بھولی مِس ہے بے چاری' بچوں جیسی معصومیت ہے اس کے چہرہ پر' اس کے دل میں مِس کے لئے سچی ہمدردی کا چشمہ یوں پھوٹ پڑا کہ اس نے خود کو اس سے شرابور ہوتے پایا۔ نہ معلوم بے چاری کے گھر کے حالات کتنے خراب ہوں گے جو یوں نوکری کر رہی ہے' پتا نہیں گھر

کے کتنے لوگوں کا بوجھ اٹھا رہی ہے۔ یقیناً ایک کھانستا چھینکتا مریل باپ ہوگا (ایسے گھروں میں ایک آدھ ایسا باپ ضرور ہوتا ہے) بوڑھی ماں ہوگی۔ دکھوں اور روگوں کی ماری (ایسی مسوں کی مائیں ہمیشہ پریشان ہی رہتی ہیں اور نہیں تو مِس کی شادی کی وجہ سے) ایک دو نکھٹو بھائی بھی ہوں گے (کماؤ بہنوں کے بھائی عموماً نالائق ہی ہوتے ہیں) چھوٹی بہنیں ہوں گی (وقت بے وقت فرمائشیں کرنے والیں) الغرض پورے گھر کا منظر گامے کی نگاہوں کے سامنے گھوم رہا تھا اس نے دکھی ہو کر سوچا یقیناً فالتو پیسوں کے لئے یہ ٹیوشنیں پڑھاتی ہو گی۔ اب وہ ضروری کام سمجھا۔ اسے جو دیر ہو رہی تھی تو یقیناً اس نے کسی امیر کے غبی بچہ کو ٹیوشن پڑھانا ہوگی۔ گاما جوں جوں سوچتا جاتا دکھی اور آزردہ ہوتا جاتا بے چاری' بے چاری مِس' کتنی دکھیا ہوگی جبھی تو وہ راستہ بھر گم سم رہی نہ معلوم وہ کتنے عرصے سے کھل کر نہ ہنسی ہوگی۔

تیز خوشبو سے چونکا تو اسے سامنے پایا' مگر یہ وہ تو نہ تھی' ہائیں یہ کون تھی؟ آنکھیں جھپکائیں اور پھر آنکھیں پھاڑ کر دیکھا۔

سرخ رنگ کے جس سوٹ کا گریبان بہت نیچے تک جا رہا تھا وہ تن سے چپک رہا تھا۔ سفید چادر کی بُکل غائب تھی بلکہ سر سے دوپٹہ ہی نہ تھا' بس چار انچ کی سرخ منقش پٹی کندھے پر جھول رہی تھی' گہرا میک اپ اور تیز خوشبو!

جب گردن ہلانے سے سوہنی کے گھنگھرو بجے تو وہ جیسے گہرے پانیوں میں ڈوبتا ہوا ابھرا اس کے ساتھ ایک خبیث صورت بڑھیا کھڑی تھی۔ مِس ہنسی۔

"کیا دیکھ رہے ہو؟"

"کچھ نہیں۔" وہ طویل سانس لے کر بولا "بیٹھیے۔"

دونوں پیچھے بیٹھ گئیں اور جب وہ خاصا آگے آ گیا تو یاد آیا کہ بچی ہوئی گھاس اٹھانی بھول ہی گیا تھا۔

ان دونوں کی سرگوشیوں کی آواز میں ہنسی کے بلبلے ابھر رہے تھے۔ تانگہ خوشبو سے بھرا تھا اور راستہ بارش کے گڑھوں سے۔

بازار میں ایک جگہ تانگہ رکوایا گیا اور ایک مکروہ صورت مرد ایک دکان کے چھجے سے نکل کر آیا اور آگے بیٹھ گیا۔ جس کے کڑوے تمباکو کے بدبودار دھوئیں نے خوشبو پر غلبہ پا لیا۔

"اتنی دیر کر دی۔" وہ غرایا۔

بڑھیا وضاحت کر رہی تھی۔ "مسلسل بارش تھی ہم کیا کرتے۔"

"تو ٹیکسی لے لینی تھی۔" وہ پھنکارا۔

جواب میں بڑھیا کچھ منمنا دی' اس نے سگریٹ باہر پھینکی اور منہ ہی منہ میں گالی دی۔ گامے کے تن بدن میں آگ لگ گئی اس نے غصہ سے چابک اٹھائی مگر ہاتھ رک گیا۔ سوہنی کا کیا قصور؟ جی چاہا کہ اس مکروہ صورت مرد کی کمر پر ایک دو چابک رسید کر دے' چابک پڑنے سے وہ کیسے بلبلائے گا اور کیسے سیاہ کمر پر دھکتی ہوئی سرخ لکیریں ابھر آئیں گی اس تصور سے غصہ ٹھنڈا ہو گیا اور کان مکروہ صورت مرد اور خبیث صورت بڑھیا کی باتوں پر لگا دیئے۔ مِس خاموش تھی۔ اچانک بڑھیا بات کاٹ کر بولی۔

"اک سرگٹ تے دے"

گامے کی متحیر آنکھوں نے دیکھا کہ مرد کے بجائے مِس نے پرس کھول کر سگریٹ نکالی۔

اب تانگہ رکوایا تو ایک بس اسٹینڈ کے عقب میں سے ایک اور مرد نکلا مگر یہ مکروہ صورت نہ تھا۔ قیمتی لباس میں تھا۔ اس کے آتے ہی بڑھیا آگے آ گئی اور وہ پیچھے بیٹھ گیا۔ پھر وہی لیٹ آنے کا قصہ اور پھر خاموشی' راستہ کا کیچڑ' گڑھوں کا گندا پانی۔

نیلا گنبد پہ تانگہ رکوا کر وہ سب انارکلی چلے گئے۔ گاما عجب کشمکش میں تھا۔ وہ یہاں سے چلا جانا چاہتا تھا مگر آدھے بلکہ سارے دن کی کمائی کیسے چھوڑ دے عجب مصیبت تھی ان کے انتظار کے بغیر چارہ بھی نہ تھا اور رکنے کو جی بھی نہیں چاہتا تھا۔

لعنت بھیجو ان کے پیسوں پر' مگر لعنت بھیجنی آسان بھی نہ تھی' اس نے اس بوندوں بھرے دن میں ایک پیسہ نہ کمایا تھا اور اب تو یوں بھی شام کے سائے ڈھل رہے تھے اور اس نے آج دوپہر کو کھانا بھی نہ کھایا تھا۔ لہٰذا جلتا بھنتا بیٹھا رہا۔

وہ واپس آئے تو بڑھیا بنڈلوں کے بوجھ سے گویا دبی جا رہی تھی' مرد کے پیکٹ میں سے مچھلی اور کبابوں کی مہک اٹھ رہی تھی' چند قدم پیچھے مِس اور مکروہ صورت مرد باتیں کرتے آ رہے تھے۔ ایک لمحہ کو مِس سے آنکھیں چار ہوئیں تو گامے نے منہ دوسری طرف

پھیر لیا' وہ تانگہ میں بیٹھے تو مچھلی کی خوشبو نے منہ پانی سے بھر دیا۔

تانگہ چل دیا' تانگہ چلتا رہا۔

شہر کی نئی آبادی کے چوک میں تانگہ رکوا دیا گیا' سب اتر گئے' مرد نے گامے کے ہاتھ پر جو نوٹ رکھا وہ اس کی توقع سے بڑا تھا۔ وہ انہیں جاتے دیکھتا رہا اور بالآخر جب تانگہ موڑنے لگا تو چوڑیوں بھرے خوبصورت ہاتھ نے رکنے کا اشارہ کیا۔ اس کی نگاہ کے دائرے میں خوبصورت چہرہ' شوخ میک اپ اور بھڑکیلے کپڑے آ گئے مگر اس نے دائرہ مکمل کر لیا۔ مہین آواز نے روکا۔

"اے تانگہ والے۔"

مگر وہ چلتا گیا۔

گھر آ کر حسب عادت تانگہ کھولا' سوہنی کو باندھا' آگے گھاس ڈالی' پانی رکھا اور خود چارپائی پر ڈھ گیا۔ اعصابی تناؤ سے جسم تنی کمان تھا۔ کنپٹی کے پاس ایک رگ پھڑک رہی تھی۔ غصہ نے بھوک بھی اڑا دی تھی۔ خالی معدہ میں گڑبڑ ہو رہی تھی اور پھر اس کی نگاہ سوہنی پر پڑی جو گھاس کے ڈھیر کے سامنے ساکت اسی کو دیکھ رہی تھی۔

وہ چیخ کر بولا۔ "میرا اس سے کیا تعلق؟"

سوہنی لاتعلقی سے دیکھتی رہی۔

"اور......اور تو نے ابھی تک گھاس کیوں نہیں کھائی۔" وہ دھاڑا۔ "اچھا! اچھا تو تجھے یہ گھاس پسند نہیں' آج دانہ نہیں ملا تو گھاس پسند نہیں آ رہی؟ اچھا! تو تجھے دانہ چاہیے ہری ہری گھاس چاہیے' سوکھی گھاس حلق سے نہیں اترتی...... ہری گھاس مانگتی ہے۔ ذلیل! ہری ہری گھاس مانگتی ہے۔ حرام زادی' ذلیل' کتیا بے شرم بے حیا......"

گامے کے منہ سے جھاگ نکل رہی تھی۔ پھر اس نے چابک اٹھایا اور سوہنی کی پیٹھ پر چابکوں کی برسات شروع کر دی۔

O.....O.....O

توتا کہانی

بیگم جمال بڑی دیر سے آئینہ کے مقابل تھی!

جب آئینہ نے پرم کیے ہوئے بالوں، گرین آئی شیڈ، ٹویزر سے تراشیدہ بھوؤں، امپورٹڈ آئی لیشز، بلش آن والے گال پر مصنوعی تل اور جسم کے ساتھ لپٹے ہوئے پیرٹ گرین سوٹ کے ساتھ میچ کرتی لپ اسٹک کے بارے میں اظہار اطمینان کر دیا تب کہیں بیگم جمال نے اطمینان کی طویل سانس لی، یوں کہ شرٹ اوپر ہی اوپر اٹھتی چلی گئی۔ تب آئینہ نے آنکھ ماری۔

''یوڈرٹی!'' وہ اٹھلا کر بولی۔

آئینہ بھی جواب میں خوشی سے کھل اٹھا۔ ''سیم ٹو یو!''

بیگم جمال نے قہقہہ لگایا۔

''اے جان قیس تیرے ارادے کدھر کے ہیں۔'' آئینہ نے پوچھا۔

''پھر شعروشاعری شروع کر دی۔'' وہ مصنوعی غصہ سے بولی۔

''کیوں شعروشاعری میں کیا خرابی ہے؟''

''' یونو! میں ایک پریکٹیکل عورت ہوں اور شاعروں کی خیالی باتوں میں کیا رکھا ہے بھلا؟''

''آئی نو! آئی نو!''

''شٹ اپ! یوڈونٹ نو ون تھنگ فرام دی ادر''

''بٹ...... آئی سی...... دی سٹیلنگ آئی۔''

''اہنہ! سٹیلنگ آئی۔ مائی فٹ''

''اچھا ڈیئر برا نہ مناؤ۔ یہ تو بتاؤ کہاں جا رہی ہو؟''

''کہیں بھی نہیں''

''تو پھر یہ چلتا پھرتا اسلحہ خانہ کیوں؟''

''میں بہت بور ہو رہی ہوں۔''

''کیوں؟''

''پتا نہیں، بس...... کچھ عجب سی حالت ہے ان دنوں میری۔''

''سہیلیوں سے گپ شپ کر لی ہوتی''

''اونو! سٹوپڈ بچز، سب کی سب اسکینڈلز مونگر۔ اور یونو، مجھے فضول کے اسکینڈلز سے کوئی دلچسپی نہیں۔''

''تو؟''

''سوچتی ہوں...... کہیں گھوم آؤں...... کچھ شاپنگ ہی کر لوں۔''

''ہاں یہ ٹھیک رہے گا...... ویسے بھی کوکنگ آئل اور واشنگ پوڈر ختم ہو چکے ہیں۔''

اس نے برا مان کر آئینہ کو گھورا۔ ''پھر بے تکی ہانکنے لگے۔''

''اچھا بے تکی نہیں ہانکتا، چلو تک کی......''

''یو ایڈیٹ مِرر! تم ان باتوں کو نہیں سمجھ سکتے۔''

''کیوں نہیں سمجھ سکتا'' اس مرتبہ آئینہ نے برا منایا۔ ''میں تمہارا راز دار بھی ہوں اور چاہنے والا بھی۔''

''دیٹ آئی نو!''

''تم یہ کیوں بھول جاتی ہو کہ میں تمہاری اولین محبت ہوں سو چو آج سے......''

وہ جلدی سے بات کاٹ کر بولی۔ ''مجھے یاد ہے اس بہانے میری عمر کا حساب لگانا نہ شروع کر دینا۔''

''نہیں۔'' وہ ہنسا ''میں تمہیں خوفزدہ نہیں کرنا چاہتا...... سنو!''

"ہوں۔"

"کبھی کبھی میرے دل میں شدید خواہش پیدا ہوتی ہے کہ کسی چھومنتر سے میں مرد بن جاؤں۔"

وہ اسے مخمور نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ "اچھا؟"

"محض مرد نہیں...... بلکہ صرف تمہارا مرد بن جاؤں"

"پھر؟" وہ جیسے شرما رہی تھی۔

"پھر؟" وہ جیسے سوچتا ہوا بولا۔ "پتا نہیں! شاید تم ٹھیک ہی کہتی ہو کہ میں ان باتوں کو نہیں سمجھ سکتا۔"

وہ نیم وا آنکھوں سے آئینہ دیکھے جا رہی تھی، وہ پھر بولا "ویسے ایک بات تو تمہاری درست ہے۔"

"کیا؟"

"یہ شعر و شاعری واقعی فضول شے ہے۔"

"اچھا؟ اچانک انکشاف کیسے؟"

"اب دیکھو نا میرے جذبات کیا ہیں جب کہ شاعر یوں کہتا ہے:

اپنی تو جہاں آنکھ لڑی پھر وہیں دیکھا
آئینہ کو لپکا ہے پریشاں نظری کا

"واہ کیا شعر ہے۔" وہ خوش ہو کر بولی۔ پھر چپ ہو کر دیکھتی رہی اور اب جو بولی تو آواز مہین ملائم ریشمی رومال میں تبدیل ہو چکی تھی۔ "ایک بات پوچھوں؟"

""پوچھو!"

"سچ بتاؤ گے نا؟"

"تم جانتی ہو میں نے تم سے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔"

"کیا میں واقعی خوبصورت ہوں؟"

اور جواب میں آئینہ کرچی کرچی ہو گیا۔ وہ ہنسی۔

"اچھا! اب یہ ایکٹنگ بند کرو۔ اب میں چلتی ہوں۔" پھر گردن کو ذرا سا خم دے

کر بولی۔ "بائی!"

"او کے! سی یو۔" لہجہ بچھڑے عاشق جیسا تھا۔

وہ میچنگ پرس ہلاتی کمرہ سے باہر تو نکل آئی لیکن وسیع کوٹھی کے عریض لان میں گومگو کے عالم میں کھڑی سوچتی رہی کہ جائے کہاں؟ کیا کرے؟ گاڑی نکال لے؟...... اعصابی تناؤ کے باعث خود کو کسی کمان محسوس کر رہی تھی لہٰذا گاڑی چلانے میں خطرہ تھا یوں بھی ذہن شہد کی بھنبھناتی مکھیوں کا چھتہ بنا ہوا تھا اور کبھی کبھی یوں ہی بلا وجہ جسم میں جیسے لرزش سی دوڑ جاتی! تو اب؟

بیگم جمال کو اللہ نے سب کچھ دے رکھا تھا سوائے جمال صاحب کے جو اس سے بالعموم دور ایک دوسرے ملک میں کاروبار کیا کرتے، کاروبار کیا، بس سونے کی کان تھا۔ لہٰذا بیگم جمال کی خوش قسمتی کی طویل فہرست کا آغاز تابعدار امیر جمال صاحب سے ہوتا تھا۔ سال دو سال بعد آتا تو محبت اور تحائف سے لدا پھندا۔ البتہ چیک باقاعدگی سے آتے لہٰذا خوش قسمتی کی بقیہ فہرست ان چیکوں کا ضمیمہ تھی۔ ہاں ایک بات تھی کہ خوش قسمتی کی اس فہرست میں بچوں کے نام نہ دیکھے جا سکتے تھے۔ لہٰذا کئی امور کے لحاظ سے وہ فارغ تھی۔ اتنی فارغ کہ اب یہ فراغت وبال بن رہی تھی۔ چنانچہ ایسی فارغ امیر عورتوں کی سرپرستی اور صدارتوں کی متلاشی سوشل ورکر قسم کی بیگمات نے اسے بھی دریافت کر لیا اور یوں برج پارٹیوں چیریٹی شوز اور کلچرل فنکشنز کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ مگر بیگم جمال طبعاً سوشل اینیمل نہ تھی۔ اس لئے اسے چندہ میں بھاری رقوم کے چیک دے کر دکھی انسانیت کی خدمت میں کوئی خاص مزا نہ ملتا، لہٰذا ان سب سے بے زار ہو گئی۔ کچھ عرصہ تک مطالعہ سے خود کو بہلایا اور ہیرلڈ روبنز سے لے کر جیکی کولینز تک تمام بیسٹ سیلرز پڑھ ڈالے، ویڈیو دیکھے، کیسٹس سنیں، طرح طرح کے کھلونے تلاش کئے، مگر بے کلی اور اس سے جنم لینے والی بدمزگی برقرار رہی، کبھی کبھی تو بوریت جیسے ایک دورہ کی شکل اختیار کر لیتی تب وہ بے تحاشا شاپنگ کرتی ایسی افراتفری کی شاپنگ کہ بیشتر ایسی چیزیں خرید لی جاتیں جن کی ضرورت نہ ہوتی لیکن یوں بے معنی خرچ سے بھی خاص قسم کا سکون ملتا اور ایک گونہ طمانیت کا احساس ہوتا ہر چند کے عمر اس کی بھی طویل نہ ہوتی۔

آج بے کلی سے وہ جلے پاؤں کی بلی بن رہی تھی، آئینہ نے کچھ بوریت کم کردی تھی۔ ویسے آئینہ کی ایک بات تو درست تھی، اب وہی اس کا دوست رہ گیا تھا اور اس سے کلام خوش آتا تھا۔ کم بخت کیا مزے مزے کی باتیں کرتا ہے گویا سچ مچ کا مرد ہو۔ باتیں کم اور گدگدی زیادہ!

وہ پرس جھلاتی فٹ پاتھ پر چل رہی تھی، کبھی کبھی کوئی راہ گیر اسے دیکھ کر ٹھٹھک سا جاتا تو اطمینان بھری مسکراہٹ ہونٹوں پر کھیل جاتی کہ اسے دیکھ کر یوں ٹھٹھکنا، آنکھوں کا کھلنا، کھلے منہ کا بند نہ ہونا اور پُر معنی مسکراہٹیں ہی اب تو من بھاتا کھاجا تھیں۔

وہ ادھر ادھر دیکھتی جا رہی تھی کہ اچانک نگاہ فٹ پاتھ کے کنارے بیٹھے حال بتانے والے کی جانب اٹھ گئی جس کے گرد بد قسمت لوگوں کا دائرہ بنا تھا اور طوطا قسمت کا حال بتانے والا لفافہ نکال رہا تھا۔ اس کا جی مچلا کہ رک کر طوطے سے قسمت کا حال معلوم کرے اور عین اسی لمحہ گویا طوطے نے اس کے دل کے بات سمجھ کر گردن گھمائی اور بیگم جمال نے خود کو طوطے کی گول آنکھوں میں جھانکتے پایا۔ طوطا معنی خیز انداز سے آنکھیں نچا کر بولا۔

''ان لفافوں میں تمہاری قسمت کا حال سا سکتا ہے کہیں۔''

وہ بھونچکی سی ایک لمحہ ٹھٹھک کر رہ گئی۔ دوسرے لمحہ نظریں اٹھائیں تو دیکھا کہ لفافہ نکال لینے کے بعد طوطا اپنے مقام پر بیٹھا مالک کے ہاتھ سے دانہ کھا رہا ہے اور پوچھنے والا قسمت کا حال سن کر خوش ہو رہا تھا۔

گھبرا کر رفتار تیز کر دی۔ سامنے ریستوران نظر آیا تو پھولی سانسیں مرتب کرنے کو وہاں جا گھسی اور بلیک کافی پیتے ہوئے سوچنے لگی۔ غالباً میں ابنارمل ہوتی جا رہی ہوں جو طوطا بھی باتیں کرتا محسوس ہوتا ہے۔ کافی سے خود میں نئی توانائی محسوس کی۔ جی تو چاہا کہ اب گھر واپس چلی جائے مگر پھر سوچا نہیں، آج اتنا پیدل چلو کہ تھکن سے پاؤں دکھنے لگیں، تا کہ اس تھکن ہی کی وجہ سے رات کو آرام سے نیند آ جائے۔ یہ بے خوابی تازہ الجھن تھی!

یوں ہی چلتی رہی، بے قرار سی، کبھی کبھی کسی شوکیس میں جھانک لیتی مگر شاپنگ کا موڈ نہ بنا پاتی اور پھر وہ چلتی چلتی ٹھٹھک گئی!

اسے دیکھ کر طوطے نے سیٹی بجائی تھی۔

یہ اس کا وہم نہ تھا سامنے پالتو پرندوں کی دکان تھی۔ رنگ برنگ کے طوطے، کبوتر، پیاری پیاری چڑیاں دروازہ کے قریب پنجرہ میں بند طوطے نے اسے دیکھ کر سیٹی بجائی تھی۔ بالکل ان امریکن سیلرز کی مانند جو بندرگاہ پر اترتے ہی پہلی نظر آنے والی لڑکی کو دیکھ کر بے اختیار ہو کر سیٹی بجا دیتے ہیں۔

آنکھیں چار ہونے پر طوطا دیدے نچا کر بولا۔ ''اندر آ جاؤ''

''ہائیں تم بولتے بھی ہو؟''

''کیوں...... میں کیوں نہیں بول سکتا؟'' وہ بولا ''بس اندر آ کر مجھے خرید لو۔''

''کیوں؟''

''بس میری خواہش ہے کہ تم مجھے خرید لو۔''

''مگر مجھے طوطوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔''

''مگر مجھے تو عورتوں سے دلچسپی ہے پلیز!''

لاجواب ہو کر وہ دکان میں داخل ہو گئی اور مالک سے پوچھا۔

''یہ بولتا ہے؟''

''کاٹھا ہے جی!''

''کیا مطلب؟'' اس نے طوطے کی طرف دیکھا جو اس گفتگو سے لاتعلق اب سر جھکائے بیٹھا تھا۔ دکاندار وضاحت کر رہا تھا۔ ''یہ ان طوطوں میں سے نہیں جو بول سکتے ہیں......''

''کبھی بھی نہیں۔'' اس نے پھر طوطے کو دیکھا۔

''شاید بعد میں...... بادام وغیرہ کھانے کے بعد بول پڑے تو اور بات ہے۔ فی الحال تو نہیں''

''اچھا؟'' وہ تذبذب میں تھی۔

''بیگم صاحبہ! میں غلط بات نہیں کرتا ویسے اور طوطے ہیں، بہت اچھے اور سستے بھی......''

''نہیں'' اس نے فیصلہ کرلیا ''مجھے یہی لینا ہے۔''

اس نے کبھی طوطے نہ خریدے تھے اس لئے یہ فیصلہ نہ کر پائی کہ قیمت کم ہے یا زیادہ۔طوطا تو اب خرید ہی لیا تھا لہٰذا قیمت کا کیا تردد؟

گھر آ کر بولی۔ ''تمہارا مالک تو کچھ اور کہہ رہا تھا؟ ''

''وہ بھی جھوٹ نہ کہہ رہا تھا۔''

''کیا مطلب؟''

''عام حالات میں تو واقعی گونگا ہوں لیکن ایک خوبصورت عورت دیکھ کر میری زبان خود بخود چلنے لگتی ہے۔''

آئینہ نے طنزاً قہقہہ لگایا۔

وہ پنجرہ اٹھا کر بیڈروم میں لے گئی۔

''یہ کیا چکر ہے؟'' وہ پریشان ہو کر بولی۔

''کوئی چکر نہیں بیگم جمال''

''ہائیں!تم میرے نام سے بھی واقف ہو؟''

''کیوں نہیں''

''مگر کیسے......؟''

''اسے چھوڑو!میں تو اور بھی بہت سی باتوں سے واقف ہوں۔''

''کیا کہا؟''

''کچھ نہیں۔'' وہ گردن ٹیڑھی کر کے گویا مسکرایا۔

''تم کیا مجھے جانتے ہو؟''

''کچھ بھی نہیں' بھلا میں نے کیا جاننا تھا۔یہ تو ویسے ہی میں نے سسپنس پیدا کرنے کو کہا تھا۔''

''اچھا یہ بتاؤ تم انسانوں جیسی باتیں کیسے کر لیتے ہو۔''

''انسانوں جیسی نہیں۔صرف مردوں جیسی......''

''مردوں جیسی......کیا مطلب؟''

''نہیں سمجھی؟''

''نہیں''

''چلو!بعد میں سمجھ لیں گے۔''

''نہیں!ابھی بتاؤ۔''

''دیکھو!میں پہلے مرد ہوتا تھا''

''ہائے اللہ!''

''سنو میری دکھ بھری داستان''

طوطا بولا۔''میں ایک ملک کا شہزادہ تھا حسین وجمیل' ایک پری کی محبت میں گرفتار' مگر ایک دیو پلید بھی اس پری کا خواستگار تھا۔چنانچہ ایک دن اس نے جادو کی ایک انگوٹھی سے مجھ پر غلبہ پا کر مجھے طوطا بنا دیا۔''

وہ منہ کھولے سن رہی تھی ''اور اس پری کا نام؟''

''سبز پری''

وہ کھلکھلا کر ہنس دی ''آخر طوطے ہی رہے نا۔عشق بھی کیا تو سبز پری سے۔''

''تم نے بھی تو یہی لباس پہن رکھا ہے۔'' وہ نرمی سے بولا۔

''ہائے میں مری!''

''سنو!کیا یہ ممکن نہیں کہ تم وہی سبز پری ہو جو مجھ سے زبردستی چھین لی گئی تھی۔''

وہ جھینپ سی گئی ''واٹ نان سنس''

''خیر چھوڑو اس قصہ کو......تمہیں ایک شعر سناؤں؟''

''مجھے شعروشاعری پسند تو نہیں......لیکن سناؤ!''

''دراصل یہ شعر ابھی کہا ہے' تمہیں دیکھ کر''

''ارشاد!''

تب طوطے نے لہک لہک کر یہ شعر پڑھا:

آتی نئے انداز سے اب سبز پری ہے
پر سبز ہیں لب سرخ ہیں پوشاک ہری ہے

طوطا اسی طرح کی لچھے دار باتوں سے بیگم جمال کا جی پرچاتا رہتا اور وہ ان باتوں کی اتنی عادی ہوگئی کہ آئینہ حاسد بن گیا۔

''اس مردار طوطے نے تمہیں طوطا چشمی سکھادی ہے۔''

''ہی از جسٹ اے برڈ!''

''مجھے چھوڑ کر تم اس سے پیار کرنے لگی ہو۔''

''ڈونٹ بی سلی''

ایک دن اسے شرارت سوجھی اور طوطے کو آئینے کے مقابل کر دیا خیال تھا کہ دونوں خوب لڑیں گے مگر ہوا الٹ یعنی دونوں کی سٹی گم ہوگئی' ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم والی کیفیت۔ طوطا آئینہ میں سراپا دیکھ رہا تھا یا آئینہ طوطے کی چشم کے دریچے سے خود کو جھانک رہا تھا؟ جب دونوں اسی طرح خاموش رہے اور ایک دوسرے کو جلی کٹی نہ سنائیں تو بور ہو کر پنجرہ واپس بیڈروم میں رکھ دیا مگر ایک دن وہاں سے بھی اٹھا دیا کہ کپڑے بدلتی کو دیکھ کر طوطے نے خاص انداز سے یوں سیٹی بجائی کہ وہ شرما گئی مگر یوں جلاوطنی پر طوطا روٹھ گیا تو واپس لے آئی۔ طوطے نے اس کا دل لگا دیا تھا اور خود طوطے میں بھی ایسی مزاج شناسی پیدا ہو چکی تھی جس سے اس کا خاوند اب تک محروم تھا۔

وہ باہر جانے سے پہلے پوچھتی۔

''یہ شرٹ کیسی رہے گی؟''

''ٹھیک نہیں!''

''کیوں؟''

''گلے کی وی لمبی نہیں''

''مگر آئینہ کو تو پسند ہے۔''

''اسی لئے تو یہ ٹھیک نہیں۔ اسے کیا پتا ان باتوں کا۔''

ایک دن طوطا آہ بھر کر بولا ''نمودار چیزیں چھپانے سے حاصل؟''

''کیا مطلب؟'' وہ چونکی۔

''کچھ نہیں۔''

ان ہی باتوں سے جی بہلا رہتا۔ اب وہ پہلے کے مقابلہ میں کہیں زیادہ مطمئن اور مسرور تھی۔ اس نے بعض راز دار سہیلیوں سے جب بات کی تو وہ مارے اشتیاق کے طوطے کی باتیں سننے چلی آئیں مگر یہ ان کے سامنے بالکل کاٹھ کا مادھو بن گیا' باتیں اور اشعار تو کجا' ٹیں بھی نہ کی۔ تب فخر سے سوچا یہ صرف مجھ ہی سے ہم کلام ہونا چاہتا ہے۔ کسی دوسری عورت کو اس قابل نہیں سمجھتا اور یوں طوطے کی دلجوئی میں مزید محو ہوگئی۔

آج شام سے ہی ہلکی مگر مسلسل بارش ہو رہی تھی اور خنکی کے ساتھ ساتھ بیگم جمال کے ڈپریشن میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ بیزار ہو کر ٹی وی بند کر دیا۔ وڈیو سے بھی افاقہ نہ ہوا۔ ناول کھولا مگر یوں ہی بے خیالی سے صفحات الٹتی چلی گئی۔ عجب ذہنی انتشار تھا اور جسم جیسے شکنجہ میں کسا جا رہا تھا۔ انگلیاں کھولیں اور بند کیں تو ان کے چٹخنے سے گویا بیڈروم گونج اٹھا' ورزش کرنے کے انداز میں بازو پھیلا دیئے یوں لگا کہ یہ دیواروں سے جا لگیں گے۔ پنڈلیوں پر زور زور سے مکے مارے تو محسوس ہوا ان کی مچھلیاں پتھرا چکی ہیں' ایسی حالت ہو رہی تھی کہ طوطا بھی یاد نہ رہا جو گردن ٹیڑھی کئے اسے بڑے اطمینان سے دیکھ رہا تھا۔

''کیا دیکھ رہے ہو؟'' وہ چڑ کر بولی۔

''کچھ بھی تو نہیں۔''

''نہیں! کچھ تو ہے۔''

''اجی میں تو تمہیں دیکھ رہا ہوں۔''

''کیوں؟''

''ویسے ہی......''

''ویسے ہی نہیں......کوئی بات ہے۔ ہے نا؟''

''ہاں۔''

''کیا؟''

''تم بہت بے چین ہو۔''

''وہ تو ہوں''

''مگر یہ بھی سوچا......کیوں؟''

''سوچنا کیا......بس ہوں۔''

''کچھ کرنے کو جی چاہتا ہے؟''

''پتا نہیں وہ شاید......''

''میرا خیال ہے کہ مجھے تمہاری بے چینی کی وجہ کا علم ہے۔''

''اچھا؟'' وہ بے یقینی سے بولی۔

''کیا تمہیں جمال صاحب یاد نہیں آ رہے؟''

''کون؟......ہاں......شاید......غالباً وہی۔''

''غالباً نہیں یقیناً!''

''چلو یقیناً......تو پھر؟''

''تو کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ ان کے بارے میں کسی سے کچھ باتیں کر لو۔''

''ان کے بارے میں کس سے باتیں کر لوں؟......اچھا چلو مان لیا......مگر کس سے ان کے بارے میں باتیں کر لوں۔''

''دلدار مرزا سے......''

''دلدار مرزا سے......؟''

''ہاں ہاں وہ جو سامنے والی کوٹھی میں رہتا ہو۔''

''وہ......اس کی ریپوٹیشن تو کچھ اچھی نہیں''

''تو تم نے کون سا اس سے ووٹ مانگنا ہے۔ چند باتیں ہی تو کرنی ہیں اور وہ بھی جمال صاحب کے بارے میں۔''

''مگر وہ تو جمال کو نہیں جانتا''

''تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے بلکہ یہ تو اور بھی اچھا ہے کہ یوں آزادی سے جس طرح کی باتیں چاہو اس سے کر سکتی ہو''......

''کیا مطلب ہے تمہارا؟''

''مطلب وطلب کچھ نہیں بس یہی جمال صاحب کے بارے میں باتیں۔''

''مگر کیسی باتیں؟''

''یہی باتیں کہ وہ کتنے اچھے ہیں تمہارا کتنا خیال رکھتے ہیں۔''

''ہاں۔''

''ان کے بارے میں خوبصورت باتیں۔''

''ہاں''

''ان کی خوبیوں کی باتیں''

''ہاں''

''ان کی خامیوں کا تذکرہ''

''خامیاں، مگر وہ بے حد شریف شوہر ہیں۔''

''چلو یہ نہ سہی۔''

وہ کچھ دیر تک خاموشی سے طوطے کو گھورتی رہی، پھر بولی۔ ''نا بابا''

''کیوں''

''ڈر لگتا ہے''

''ڈر کس بات کا! تمہاری نیت تو ٹھیک ہے نا؟''

''وہ تو ٹھیک ہے۔''

''تو پھر کس بات کا ڈر؟''

''کسی نے دیکھ لیا تو؟''

''مگر تم کوئی غلط کام تو کرنے نہیں جا رہیں...... ہے نا؟''

''ہاں! یہ تو ہے؟''

''تو پھر گھبراؤ مت۔ اطمینان سے چلی جاؤ''

''مگر میں وہاں جا کر کیا کروں گی؟''

''بھئی تم نے بھلا کیا کرنا ہے، ظاہر ہے باتیں ہی کرنی ہیں۔''

''ہاں......'' پھر کچھ سوچ کر پوچھا۔ ''مگر کیا بہانہ کروں وہاں جانے کا۔''

''عجب عورت ہو۔'' طوطا غصے سے بولا۔ ''عورت ہو کر جھوٹ بولنا نہیں آتا؟ بیوی ہو کر بہانے کرنے نہیں جانتیں؟ سنو۔ کوئی خاص کہانی گھڑنے کی ضرورت

نہیں۔ سب چلے گا۔ مثلاً باتھ روم میں کاکروچ ہے' کچن میں چوہا نظر آیا ہے اور بیڈ روم کی چھت پر ایک چھپکلی رینگ رہی ہے۔ بہانوں کی کیا کمی ہے زرخیز ذہن والیوں کیلئے۔''

''یوڈرٹی اولڈ اینڈ لیچرس......'' وہ اب پہلی مرتبہ کھلکھلا کر ہنسی پھر جسم پر ہاتھ پھیر کر بے شکن لباس کی شکنیں دور کرتے ہوئے پوچھا۔

''کیا پہنوں؟''

''جو چاہو پہن لو...... کچھ فرق نہ پڑے گا۔''

''پھر بھی......؟''

''میں تو کہتا ہوں اسی طرح چلی جاؤ بغیر میک اپ کے زیادہ پیاری لگ رہی ہو۔ فطری سی......''

''بنا تو نہیں رہے ہو؟''

''ہرگز نہیں۔''

''اچھا تو پھر میں چلتی ہوں۔''

''گڈ لک!''

بیڈ روم سے نکلی تو ڈریسنگ روم میں آئینہ دیکھ کر سراپا کا جائزہ لینے کا سوچا مگر اس وقت وہ آئینہ کی جلی کٹی سننے کے موڈ میں نہ تھی۔ لہٰذا تیزی سے کمرہ سے باہر نکل گئی۔

O.....O.....O

میاں بیوی اور جیمز بانڈ

رین کوٹ کے کھڑے کالر نے گردن چھپالی تھی۔ بڑے بڑے سیاہ شیشوں والی گاگلز نے تقریباً نصف چہرہ ڈھانپ رکھا تھا۔ سر پر بڑی سی فیلٹ' جس کے آگے کو جھکے ہوئے کنارے نے ماتھے پر سایہ کر رکھا تھا۔ آئینہ میں اپنی یہ شباہت بلکہ زیادہ بہتر تو یہ کہ ہیئت کذائی دیکھ کر میں مسکرا دیا' مگر نہیں' میں نے غیر مطمئن انداز سے خود کو گھورتے ہوئے سوچا۔ مسکراہٹ کا یہ انداز تو بڑا عام بلکہ عامیانہ سا ہے۔ جیسے کہ بالعموم میں مسکراتا ہوں یعنی اپنی کلاس میں بدتمیز لڑکوں کے سامنے مسکرانے کی کوشش کرتا ہوں' نہیں' یہ مسکراہٹ نہ چلے گی۔ مجھے تو یوں مسکرانا چاہئے جیسے کوئی سیکرٹ ایجنٹ مسکراتا ہے جیسے جیمز بونڈ مسکراتا ہے ......جنسی مسکراہٹ' یہ سب بے سود تھا اس لئے کہ میں شون کونری نہ تھا ویسے بھی میرے گال پر وہ لکیر نہ تھی جو اس کے گال کو کسی سیکرٹ ایجنٹ کے گال میں تبدیل کر دیتی ہے جب یہی نہیں تو پھر کیسا زیرو زیرو سیون؟

مجھے اعتماد تھا کہ میں پہلی نظر میں تو نہیں پہچانا جا سکتا۔ اگر ڈر تھا تو صرف پہلی نظر کا دوسری نظر کی تو میں نوبت ہی نہ آنے دوں گا۔ دوبارہ آئینہ دیکھا۔ مصنوعی ڈاڑھی مونچھ لگانے کا بھی خیال آیا' پھر سوچا اتنا تردد کس لئے؟ یہ سب تو فلموں میں چلتا ہے۔ جہاں ہیرو نقلی ڈاڑھی مونچھ سے اپنے چہرے کو کیموفلاج کر کے بے دھڑک ہیروئن کے گھر جا گھستا ہے' ظالم جاگیردار کے ڈیرے پر جا دھمکتا ہے اور خونخوار ولن کے ڈین میں جا پہنچتا ہے یہی نہیں بلکہ بعض اوقات تو وہ قوالی بھی کر لیتا ہے۔

میرا ایڈونچر فلمی نہ تھا بلکہ حقیقی تھا اور شاید اسی لئے اگر ایک طرف میں کچھ نروس تھا تو دوسری طرف قدرے پر جوش بھی' بالکل اسی طرح جیسے مقابلہ سے پہلے کھلاڑی قدرے مشوش ہوتا ہے مگر میرے لئے یہ کھیل نہ تھا' ایک فرض تھا بلکہ بہتر تو یہ کہ ایک ناخوشگوار فرض تھا جسے ادا کرتے ہوئے میں ناخوش تھا۔

میں طبعاً ان لوگوں میں سے ہوں جو اپنے کام سے کام رکھتے ہیں' نہ کسی کو مشورہ دیتے ہیں اور نہ قرضہ' غالباً اسی لئے دوستوں سے تعلقات خوشگوار رہتے ہیں اور بحیثیت مجموعی حلقہ احباب میں ناپسند نہیں کیا جاتا۔ میرا عمومی قاعدہ یہی رہا ہے لیکن بعض اوقات انسان اپنے اصول توڑنے پر بھی مجبور ہو جاتا ہے بالخصوص اس وقت جب معاملہ جگری یار کا ہو تو پھر یہ نوبل کاز بن جاتی ہے۔

جمال بچپن کا دوست تھا' ہم ایک ڈیسک پر بیٹھتے تھے اور اتنے گہرے دوست تھے کہ ہر برے کام میں شریک کار...... مثلاً اسکول سے اکٹھے بھاگ کر پہلی فلم دیکھی اور پکڑے جانے پر اکٹھے مرغے بنے۔ اس طرح ہم نے اکٹھے چوری چوری پہلی سگرٹ پی' امتحان کے دنوں میں اکٹھے پڑھتے اور ایک دوسرے کی نقل مار کر پاس ہو جاتے' بی اے کے بعد میں نے یونیورسٹی کا رخ کیا اور اس نے انگلستان کا...... اب جو راہیں جدا ہوئی ہیں تو مل نہ سکیں' میں ایم اے کے بعد لیکچرار ہو گیا اور وہ وہاں پونڈ کمانے میں مصروف رہا' کبھی کبھار کوئی خط آ جاتا یا پھر میری جانب سے عید کارڈ اور اس کی جانب سے نیو ایئر کارڈ اور بس!

پھر اس نے شادی کی اطلاع دی' وہیں کسی مسلم گھرانہ میں' چلو یہ تو اس نے عقل مندی کی میں نے سوچا' ہم ایشیائی مردوں اور بالخصوص پاکستانی شوہروں میں میل شوزم کچھ ضرورت سے زیادہ ہی ہوتا ہے۔ میموں کی جو تڑک پھڑک پہلے من کو للچاتی ہے' بیوی بننے کے بعد وہی بلڈ پریشر میں اضافہ کا سبب بنتی ہے لیکن جب میں نے اس کی بیوی کو دیکھا تو احساس ہوا کہ اس کی تڑک پھڑک بلڈ پریشر والی نہیں بلکہ دل کے دورے والی ہے۔

ہوا یوں کہ ایک دن اس کا خط آیا کہ میں اب واپس آنا چاہتا ہوں۔ رنگ کے تعصب نے اب انگلستان میں جان و مال کے لئے خطرہ پیدا کر دیا ہے' جواب دینے کا سوچ ہی رہا تھا کہ کالج میں ایک دن اس کا فون آ گیا۔

''لوٹ کے بدھو گھر کو آیا''

''آیا نہیں آئے۔'' اس نے تصحیح کی۔

''کیا مطلب ہے؟''

''تمہاری بھابی بھی تو ساتھ ہے۔'' اس نے چہک کر کہا۔

''ہاں یہ تو مجھے یاد ہی نہ رہا۔''

میں نے کھانے پر مدعو کیا تو ہوٹل کا سن کر بولا۔

''سٹل بیچولر؟''

''سٹل۔'' میں نے جواب دیا۔

کنوارا ہونے کے باوجود میں نہ تو آوارہ ہوں اور نہ ہی بدنظر بلکہ اپنے پیشے کی وجہ سے کچھ ضرورت سے زیادہ ہی محتاط زندگی بسر کر رہا ہوں۔ ویسے بھی مجھے عورتوں کا زیادہ تجربہ نہیں۔ ادھر زندگی اب اتنی پر اطمینان ہے کہ مجھے تجربہ کار بننے کا کوئی خاص شوق بھی نہیں' لیکن ناتجربہ کاری حماقت کے مترادف بھی تو نہیں ہوتی کیونکہ ہماری بھابی میں بھی کچھ ایسی بات تھی جو دیگر بھابیوں میں نہ ملے گی۔ کیا وہ خوبصورت تھی؟ غالباً نہیں۔ کیا وہ بدصورت تھی؟ یقیناً نہیں۔ کیا وہ سیکسی تھی؟ شاید وہ یہ سب کچھ تھی بھی اور سب کچھ نہیں بھی' کچھ کہا نہیں جا سکتا لیکن اس کے باوجود اس میں کچھ ایسی جاذبیت تھی کہ وہ اپنی جانب کھینچتی تھی۔

بعض عورتیں ایسی ہوتی ہیں جنہیں اپنی کشش کا احساس نہیں ہوتا یا اگر ہوتا بھی ہے تو وہ لاتعلق سی رہتی ہیں اور تلوار کی تیز دھار کو مزید صیقل کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتیں لیکن یہ ان میں سے نہ تھی' اسے اپنے مقناطیسی ہونے کا احساس تھا' احساس کیا یہ تو دوسرے کو اپنی جانب کھنچتا دیکھ کر لطف اندوز بھی ہوتی تھی۔ شاید یہ اس کے نسوانی پندار کے لئے ضروری تھا۔ اپنی تمام تر ناتجربہ کاری کے باوجود میں یہ سمجھتا تھا کہ ایسی عورتیں خاصی خطرناک ہوتی ہیں۔ یہ مرد کے ساتھ بلی چوہے کا کھیل کھیلتی ہیں۔ آغاز میں تو یہ واقعی ایک کھیل ہی ہوتا ہے مگر جیسے جیسے بلی ہونے کا تجربہ بڑھتا جاتا ہے تو اس کھیل کا مزہ بھی بڑھتا جاتا ہے پھر جیسے جیسے مہارت میں اضافہ ہوتا جاتا ہے چوہوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوتا

جاتا ہے۔ اس کھیل میں سب سے زیادہ نقصان خاوند کا ہوتا ہے کہ اسے اندھا اور بہرہ چوہا بنا پڑتا ہے' بصورت دیگر...... مگر اتنی انتہا تک میں نہیں سوچ سکتا تھا تاہم اتنا تو ہے کہ کبھی وہ بلی کے پنجوں سے زخمی ہوتا ہے' کبھی اس کی انا اور پندار کا جلوس نکلتا ہے' تو کبھی اسکینڈلز کی سان پر چڑھا کر اس کی کند دھار کو تیز کرنے کی کوشش کی جاتی ہے مگر بے سود! اور یہی عالم جمال کا بھی تھا!

مجھے عورتوں کا تجربہ نہ سہی مگر مردوں کی پہچان ضرور تھی اور میں جمال کے مسئلہ کو اچھی طرح سمجھ چکا تھا کم از کم میں یہ سمجھتا تھا کہ میں اس کے مسئلے کو اچھی طرح سے سمجھ چکا ہوں۔

اس شام اتفاقاً وہ گھر میں تنہا مل گیا سگریٹ کے دھوئیں میں گھرا عجیب ہیجان کے عالم میں' مجھے دیکھ کر اس نے مسکرانے کی کوشش کی مگر ہونٹ عجب انداز میں پھیل کر رہ گئے۔

''بھابی کہاں ہیں؟''

اس نے کانپتی انگلیوں سے تازہ سلگائے ہوئے سگریٹ کو ایش ٹرے میں مسلا اور نیا سگریٹ سلگا کر ایک طویل غالباً بہت ہی طویل کش لگایا اور پھر دھوئیں ہی کی مانند منہ سے الفاظ نکلے۔ ''پتا نہیں...... غالباً کسی سہیلی کے ہاں......'' اس نے فقرہ نامکمل چھوڑ کر ایک اور طویل کش لیا۔

میں جس نازک اور خطرناک موضوع پر گفتگو کرنے آیا تھا اس طرح کی گفتگو کا کوئی تجربہ نہیں اس لئے کسی لمبی چوڑی تمہید کے بغیر ایک ہی سانس میں جو کہنا تھا کہہ ڈالا۔

اس کا سفید چہرہ بے حد سرخ ہو گیا' گویا خون کے دباؤ سے چہرہ کی جلد ادھڑ جائے گی۔ پھر ایک دم چہرہ زرد ہو گیا اور پھر آہستہ آہستہ یہ زردی بھی سیاہی میں تبدیل ہوتی گئی اور پھر بالآخر چہرہ سفید ہو گیا۔ اس نے کچھ کہنے کو منہ کھولا مگر صرف مجھے دیکھتا رہ گیا اگر اس اثناء میں اس کی آنکھوں نے کچھ کہا تو میں اسے نہ سمجھ پایا۔ اس نے ایک اور طویل کش لیا۔ جلتا سگریٹ ایش ٹرے میں پھینکا اور پھر پوچھا۔ ''چائے پیو گے؟''

میں بھی سب کچھ بول بک کر اب خود کو ہوا نکلے غبارہ کی مانند محسوس کر رہا تھا چنانچہ

خاموشی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ہم دونوں باورچی خانہ میں آ گئے اس نے گیس کھول کر اسے تیلی دکھائی اور کیتلی چولہے پر رکھ دی۔ ہم دونوں خاموش تھے صرف پانی کی سائیں سائیں خاموشی توڑ رہی تھی میں سمجھتا تھا کہ وہ کچھ کہنا چاہتا ہے مگر یہ بھی جانتا تھا کہ وہ کچھ کہہ نہ پائے گا۔ اس پر جو غصہ آیا تھا وہ آہستہ آہستہ ہمدردی اور پھر ترس میں تبدیل ہو گیا۔

پانی ابل رہا تھا اور وہ خاموش بھاپ کے مرغولے دیکھ رہا تھا۔

میں نے خاموشی سے چائے دانی اٹھائی اس میں چائے کی پتی ڈالی اور اوپر سے کھولتا پانی' خشک دودھ اور چینی کی ایک ایک چمچی پیالیوں میں ڈالی اور پھر قہوہ انڈیل دیا۔ وہ اس دوران جیسے لاتعلق سا کھڑا دیکھتا رہا۔ میں نے دونوں پیالیاں اٹھائیں اور باورچی خانہ سے باہر آ گیا اور میرے پیچھے پیچھے وہ بھی۔

ہم دونوں خاموشی سے چائے پیتے رہے' میں کیونکہ اس کے چہرہ کو نہ دیکھنا چاہتا تھا اس لئے نظریں اپنی پیالی سے اٹھتی بھاپ کی بل کھاتی مہین لکیر پر مرکوز رکھیں' تب وہ اچانک پھٹ پڑا۔

''تم نے اپنی بھابی پر الزام تو لگا دیا مگر تمہارے پاس ثبوت کیا ہے؟''

میں گڑبڑا گیا۔ ''ثبوت؟''

''ہاں ہاں ثبوت!''

''ایسی باتوں میں ثبوت کہاں ملتے ہیں؟''

''تو پھر یونہی...... نری بکواس؟''

''یونہی کا کیا مطلب؟''

''تم بھی اسکینڈل مونگر ہو۔''

مجھے آگ لگ گئی مگر میں نے نرمی سے کہا۔ ''سنو جمال! مجھے یہ یاد دلانے کی ضرورت تو نہ ہونی چاہئے کہ تمہاری اور میری دوستی کتنی پرانی ہے یا یہ کہ ہم کتنے گہرے دوست ہیں (خاموشی: سگریٹ) اس لئے جو کچھ کہہ رہا ہوں نیک نیتی سے کہہ رہا ہوں (خاموشی: چائے) میں تمہارا ہمدرد ہوں......''

''یہ تو ٹھیک ہے مگر سب باتیں کرتے ہیں۔ باتیں' محض باتیں' خالص بکواس۔

مگر کسی کے پاس...... کسی کے پاس کسی طرح کا ثبوت نہیں۔''

میں غصہ میں بولا۔ ''یار! یا تو تم ......'' مگر میں نے اس کے چہرہ پر ایک نگاہ ڈالی اور غصہ پی کر نرم بلکہ ضرورت سے زیادہ نرم لہجہ میں پوچھا۔ ''تو تمہیں ثبوت چاہئے۔''

''ہاں۔'' وہ پر جوش لہجہ میں بولا۔

''ٹھوس ثبوت''

''بہت اچھا تو تمہیں ثبوت ہی ملے گا''

''تم کیا کرو گے؟'' وہ متوحش ہو کر بولا۔

''میں نہیں جانتا...... لیکن میں تمہیں مطمئن کر دوں گا۔''

''تصویریں؟'' وہ جیسے دہشت زدہ ہو کر بولا۔ ''ٹیپ؟''

اونچی ایڑی کی کھٹ کھٹ سے پہلے ہی ہم نے اس کی مخصوص پرفیوم سونگھ لی اور ساتھ ہی وہ عجب انداز سے لہراتی اندر داخل ہوئی بنڈلوں اور پیکٹوں سے لدی ہوئی' ہونٹوں پر تازہ لپ اسٹک اور آنکھوں میں عجب چمک۔

''آہاہا۔'' وہ مجھے دیکھ کر چہکی۔ ''جیجا جی بھی موجود ہیں؟'' ...... طنز؟ استہزاء؟ تحقیر؟ کچھ کہا نہیں جا سکتا' عجب لہجہ تھا' اس کے بعد اپنی ایڑیوں پر پوری گھوم کر جمال سے مخاطب ہوئی۔

''دیکھو جمال۔ یہ آج میں نے شاپنگ کی ہے دیکھو...... یہ...... اور یہ......'' وہ ایک ایک کر کے چیزیں دکھا رہی تھی' کپڑے' پرفیومز' میک اپ کا سامان۔ ''اور...... اور دیکھو یہ میں تمہارے لئے لائی ہوں۔'' اس نے نہایت خوبصورت کپڑا اس کے سامنے پھیلاتے ہوئے کہا۔ مجھے یوں محسوس ہوا گویا کپڑے کا رنگ جمال کے چہرے پر سے گزر گیا۔ وہ تیز تیز سانس لے رہا تھا مگر وہ اس کی رنگت اور سانسوں سے بے بہرہ اپنے دھن میں گم پیکٹ کھولنے میں منہمک تھی...... ''اور یہ دیکھو' اس سوٹ کے ساتھ میچنگ ساکس اور رومال اور یہ ٹائی بھی ہے۔ ہے نا خوبصورت؟ اللہ قسم...... بہت ڈیشنگ لگو گے!'' وہ کسی ماہر سیلز گرل کی مانند چیزوں کا ڈسپلے کر رہی تھی ان کے اوصاف گنوا رہی تھی۔ بس قیمت بتانے کی کسر رہ گئی۔

اب وہ پھر میری طرف مڑی' ''اور جیجا جی! یہ آپ کے لئے۔'' اس نے ایک بے حد

خوبصورت ٹائی میرے گلے میں ڈال دی۔ پیشتر اس کے کہ میں کچھ کہتا وہ پھر بولی۔ ''اور ہاں جیجا جی اس کے ساتھ ٹائی پن بھی ہے۔ کہاں گئی اس کی ڈبیا...... ہاں یہ رہی...... دیکھئے ہرن کیسے چوکڑی بھر رہا ہے......''

میں ان کے فلیٹ سے نکلا تو وہ دونوں شاپنگ کی چیزیں سامنے رکھے بچوں کی طرح باتیں کر رہے تھے۔

اور اب سچویشن کا پر لطف' دلچسپ بلکہ طنزیہ پہلو یہ تھا کہ میں اس کی عنایت کردہ ٹائی لگائے اس کے تعاقب میں تھا۔

جمال کے جانے کے کوئی گھنٹہ بعد وہ گھر سے نکلی' میں مقابل سڑک کی ایک دوکان کی اوٹ سے فلیٹ پر نظریں جمائے کھڑا تھا۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ چند منٹ تک وہ فٹ پاتھ پر ٹہلتی رہی (یقیناً یہ کسی کی منتظر ہے) ایک دو مرتبہ گھڑی دیکھی۔ پھر ادھر اُدھر دیکھا اور پیدل چل دی (آج گاڑی خراب ہے جو پیدل جا رہی ہے؟ یا پھر اس میں بھی کوئی چال ہے؟) میں نے فیلٹ کو اور نیچے جھکا لیا اور فاصلہ دے کر پیچھے ہولیا' چلتے چلتے اس نے ایک دو مرتبہ پیچھے مڑ کر بھی دیکھا مگر میں کہاں نظروں میں آنے والا تھا۔ فوراً قریبی دوکان کے شوکیس کا ملاحظہ شروع کر دیا (کہیں اسے شک نہ ہو گیا ہو) وہ ایک بک سٹال میں جا گھسی' میں فٹ پاتھ پر منڈلاتا رہا۔ نصف گھنٹہ کے بعد باہر نکلی تو میں پھر پیچھے' اس مرتبہ وہ ایک ڈیپارٹمنٹل اسٹور میں جا گھسی اور میں قریبی بک سٹال پر کھڑا اخبارات کی سرخیاں دیکھنے لگ گیا۔ یہاں سے نکلی تو ایک ایرانی ریستوران میں جا گھسی وہ شاید کافی پی رہی ہو گی لیکن میں باہر ٹھنڈ میں کوکا کولا پیتا رہا۔ اس بے معنی تعاقب سے میں اب خاصا بور ہو چلا تھا۔ ادھر اولین جوش بھی ٹھنڈا پڑتا جا رہا تھا۔ یہ جاسوس یقیناً بہت باصبر اور ٹھنڈے مزاج کے ہوتے ہوں گے جو سارا دن اخبار میں سر چھپائے کسی موہوم امید پر کسی مشتبہ کھڑکی کی گھات میں بیٹھے رہتے ہیں۔ دوپہر ہونے کو آئی تھی' آج کی چھٹی یوں ہی غارت کر دی۔ ٹانگیں اکڑ گئی تھیں اور وہ نہ جانے کیسے جل دے گئی کہ اب غائب تھی۔ یہ سب اتنا اچانک ہوا کہ کچھ سمجھ ہی نہ آئی کہ کیا ہو گیا' ابھی ابھی وہ میری نظروں کے سامنے تھی کہ ایک چوک پر لائٹ تبدیل ہونے کے وقفہ میں وہ گم ہو گئی اور میں ہونقوں کی طرح پتلون کی جیبوں میں

ہاتھ ڈالے عین فٹ پاتھ کے درمیان کھڑا رہ گیا۔ آنے جانے والوں کے ٹکراتے کندھوں سے بے پروا میری آنکھیں اس کو کھوج رہی تھیں اور پھر یوں اچھلا گویا کسی راہ گیر نے شرارتاً سوئی چبھو دی ہو۔

''جیجا جی! میں یہاں ہوں۔'' وہ میرے پیچھے کھڑی مسخرہ پن سے مسکرا رہی تھی۔

''تم......یعنی کہ میں......'' (میں چغد جاسوس ثابت ہوا)

''یہ آپ کیا صبح سے میرا پیچھا کر رہے ہیں؟''

''میں......میں......''

''اگر میں جمال سے شکایت کر دوں کہ......'' اور اب اس نے پہلی مرتبہ مجھے غور سے دیکھا تو ہنسی ''اور یہ آپ نے کیا حلیہ بنا رکھا ہے کسی جاسوس جیسا۔'' وہ زور سے ہنسی۔

''اوہو! گلے میں کیمرہ بھی لٹک رہا ہے۔'' (ندامت، خجالت) اور زور سے ہنسی ''تو میری جاسوسی کر رہے ہیں آپ؟'' (حماقت، حماقت)

''نہیں......نہیں تو......'' میرا حلق خشک ہو رہا تھا اور سرد ہوا کے باوجود ماتھا پسینہ سے بھیگ رہا تھا اس نے اپنے پرس سے گلابی رنگ کا معطر ٹشو پیپر نکال کر میرے ہاتھ پر رکھ دیا پہلے تو مجھے سمجھ ہی میں نہ آئی کہ یہ ٹشو پیپر مجھے کیوں دیا ہے۔ پھر میں نے پسینہ پونچھنا شروع کر دیا۔ (مزید حماقت)

وہ مجھے عجب تمسخرانہ انداز سے دیکھ رہی تھی اور اس تمام صورت حال سے صحیح معنوں میں لطف اندوز ہو رہی تھی......

''اچھا تو جیجا جی! کدھر کے ارادے ہیں؟''

''میں......میں تو......کالج......''

''تو کیا آج کالج میں فینسی ڈریس شو ہے؟''

''ہاں......نہیں......نہیں تو......''

اس نے یک لخت ہنسی بند کر دی اب وہ بے حد سنجیدہ تھی اس نے آگے بڑھ کر کسی بچہ کی مانند میرے گال تھپتھپائے اور پھر بولی۔

''میں اب اس سامنے والے فلیٹ میں جا رہی ہوں جب تک جی چاہے

یہاں پہرے پر کھڑے رہئے۔ بائی جیجا جی!''

وہ ایڑیوں پر گھومی اور اگلے لمحہ وہ زیبرا کراسنگ پر تھی، میں اسے دیکھتا رہا، وہ اپنی مخصوص لہرایا چال چل رہی تھی۔ بعض جانے والوں نے اسے ٹھٹھک کر دیکھا، زیبرا کراسنگ ختم کر کے وہ فٹ پاتھ پر چڑھی، مڑی اور مجھے کھڑے دیکھ کر ہاتھ سے اشارہ کیا، مگر میں یہ نہ جان پایا کہ یہ اشارہ کیسا تھا، بلایا تھا؟ کہ مجھے واپس جانے کو کہا؟ یا وہیں کھڑے رہنے کی تاکید کی۔

O.....O.....O

علامتی مرد

بجلی نے کوند کر منظر کی ویرانی کو مزید اجاگر کیا۔ گڑھوں بھری سڑک اب سڑک نہ رہی تھی بلکہ کچے راستے میں تبدیل ہو چکی تھی۔ درخت' جھاڑیاں اور ان کے عقب میں کھیت رات کے کمبل میں ٹھٹھرے ٹھٹھرے تھے۔ شوکتی ہوا' موٹی بوندوں کی بوچھاڑ' پانی سے چھلکتے گڑھے' کیچڑ بھرا ناہموار راستہ یہ سب کار کی ہیڈ لائٹس میں چمک رہے تھے۔ اس نے پریشانی سے سوچا' یقیناً وہ راستہ بھول چکا ہے ورنہ اتنے سفر کے بعد تو وہ شہر پہنچ چکا ہوتا جھرجھری لے کر باہر جھانکا تو بجلی نے کڑک کر گویا اس کے خیال کی تائید کر دی۔ اچانک ایک بڑا اگڑھا دہانہ کھولے سامنے آگیا جسے کار نے تیرنے کے انداز میں پار کیا۔

اس نے جل کر منیجر کے گھر کی معزز خواتین سے وہ رشتے استوار کئے جنہیں کوئی بھی منیجر اپنے گھر کی معزز خواتین کے لئے کسی طرح سے بھی پسند نہیں کر سکتا' خواہ اس کے سیلز ایجنٹ نے انہیں دل ہی دل میں کیوں نہ استوار کیا ہو۔ ابھی وہ اس صبح ہی تو مال لے کر پہنچا تھا کہ منیجر کا نادر شاہی حکم ملا کہ اسی وقت واپس چل دو۔ رات کو سفر کرو' صبح دفتر سے نئے سمپلز حاصل کرو اور پھر اسی وقت جاؤ اور پارٹی سے ان سب کے اکٹھے آرڈر حاصل کرو۔ دھندلائی ونڈ اسکرین صاف کی تو منظر کی وحشت نے دہلا دیا' دل میں اندیشے امڈے چلے آ رہے تھے۔ ویسے بھی دل ناتواں ہمیشہ نت نئے اندیشوں اور واہموں میں گھرا رہتا تھا۔ ہر وقت انجانے خوف سے اعصاب تنے رہتے اور وسوسوں سے ڈیڑھ پسلی پھڑکتی رہتی' یقیناً اس کی موت اسے طوفان میں راستہ بھلا کر لے آئی ہے۔ ڈاکوؤں کا جتھہ آئے گا' اس کی تکا

بوٹی بنا کر رکھ دے گا اور پھر اس کی گاڑی میں بیٹھ کر مزید لوٹ مار کرے گا اور یوں پولیس کے ریکارڈ میں اس کی گاڑی کا نمبر درج ہو جائے گا۔ آج یہ سب کچھ ہوگا' جبھی تو وہ راستہ بھولا تھا۔ ایسی راتوں اور ایسی راہوں میں ایسی بے مہار ہواؤں اور وحشیانہ بارشوں میں جرائم کے علاوہ اور بھلا کیا ہو سکتا ہے۔ مسافر قتل ہوتے ہیں' گھروں کی چھتیں پھٹتی ہیں' لڑکیاں اغوا ہوتی ہیں اور بیویاں حاملہ......

جھرجھری لے کر سگریٹ سلگایا تو کسیلے دھوئیں نے تنے اعصاب کو قدرے سکون دیا۔ اس کے پاس تھرمس میں چائے تھی' بہت جی چاہا کہ گاڑی روک کر گرم گرم چائے کی چسکیوں کے ساتھ سگریٹ کا مزا دوبالا کرے۔ مگر خوف نے رکنے کی ہمت نہ چھوڑی تھی کہ سفر ہی میں عافیت تھی۔

اس نے تلخی سے سوچا ...... ہر برا اتفاق اسی کو لگتا ہے گویا بدبختی نے برے اتفاقات کا روپ دھار لیا ہو۔ نہ معلوم والدین نے کس پر مزاح لمحے میں اس کا نام خوش بخت رکھ دیا تھا۔ اپنے لمبوترے چہرے' مرجھائے جسم اور چھوٹے قد کی مانند یہ نام بھی اسے سخت ناپسند تھا۔ وہ کمزور مریل اور منّا سا مرد تھا۔ مرد بھی کیا علامتی مرد تھا۔ ہڈیوں کے ہینگر پر کپڑے جھولتے دیکھ کر نقلی چوکیدار کی تصویر آنکھوں میں گھوم جاتی۔ اس ناتوانی اور چھوٹے قد کی وجہ سے وہ بچپن ہی سے شدید قسم کے احساس کمتری میں مبتلا رہا تھا جس کے نتیجے میں وہ کسی ڈرپوک خرگوش کی مانند اپنی ذات کے سوراخ میں پناہ گزین بن کر رہ گیا تھا۔ لٰہذا نہ اسکول میں خوش رہا اور نہ عملی زندگی میں ...... خاموش اور ہراساں ...... ہنسی سے دور اور قہقہوں سے متنفر۔ یوں لگتا کہ لوگ اس پر ہنس رہے ہیں۔ خاموشی سے کام میں مصروف رہتا کہ ہر دم یہ احساس دامن گیر رہتا کہ بولا تو یقیناً منہ سے غلط بات ہی نکلے گی۔ جو شخص مردوں سے ہم کلامی کی جرات نہ پاتا ہو' اس نے بھلا عورتوں سے کیا کھلنا تھا۔ لٰہذا شادی کرنے کی ہمت نہ پیدا ہو سکی۔ اس کے لئے بیوی ایسا اندھا کنواں تھی جس میں ایک مرتبہ چھلانگ لگا دی تو پھر ہمیشہ کے لئے ڈوبا!

فرم کے باس کی تڑک پھڑک کرتی سیکرٹری تھی جس کے ہونٹ خون کبوتر ہوتے' ٹائپسٹ تھی جس کی قمیض اور انگیا کے فیتہ کے رنگ ہمیشہ مختلف ہوتے تھے۔ اس کے اپنے

سیل سیکشن میں بھی ایک ایسی لڑکی تھی جو جیومیٹری کی تمام اشکال اور خطوط کو سنبھال کر نہ جانے کیسے چار انچ کی ایڑی پر چل لیتی تھی...... یہ سب لڑکیاں دفتر میں دل جمعی سے کام کرنے کا بہانہ تھیں اور سبھی ان کے اردگرد منڈلانے کے بہانے تلاش کرتے رہتے تھے مگر ایک یہ خوش بخت تھا کہ ان سے فلرٹ تو کیا کرتا جائز بات کرتے وقت بھی چہرہ سرخ ہو جاتا' زبان بل کھا جاتی اور سینہ دھونکنی بن جاتا۔

شاید عام لوگوں کی نگاہ میں وہ واقعی خوش بخت ہی ہو' ایک بڑی فرم میں ملازم تھا' معقول تنخواہ' اپنا گھر اور گاڑی بھی تھی' اب یہ الگ بات کہ فوکسی کا یہ ماڈل شاید ملک بھر میں اور کہیں نہ ملے تاہم چار پہیوں پر وہ چلتی تو تھی اور اس لئے وہ نعمت کدہ تھی کہ اسے بالعموم سفر میں رہنا پڑتا تھا۔

مثانہ پھٹنے کو ہوا تو بادل نخواستہ گاڑی روکی۔ گرم گاڑی سے باہر نکلتے ہی بوندوں اور ٹھنڈے جھکڑوں نے استقبال کیا یوں کہ جسم ڈول کر رہ گیا۔ مڈ گارڈ کا سہارا لیا اور اندھیرے میں ایک طرف منہ کر کے کھڑا ہو گیا اور تب...... ہلتی جھاڑیوں کے عقب میں اسے جگنو کی مانند روشنی کی چمک نظر آئی۔ سوچا چلو اس گھر والے سے راستہ دریافت کر لیں۔ اندھیرے میں راستہ کا تعین آسان نہ تھا۔ گاڑی جو پکی سڑک سے سرکی تو سیدھی کچے پر آ گئی۔ جہاں نرم کیچڑ نے اسے بانہوں میں یوں جکڑا کہ ہر مرتبہ پہیے گھوم کر رہ جاتے۔ بادلوں' بارش اور کیچڑ کی کیونکہ ماں بہن نہیں ہوتی اس لئے ایک مرتبہ پھر منیجر کی اہل خانہ کو زحمت دینی پڑی۔ اب کیا کروں؟

اس مینہہ بھری تاریکی میں گاڑی چھوڑنے میں کوئی حرج تو نہ تھا پھر بھی جی الجھ رہا تھا۔ کھٹارہ سہی مگر تھی تو اس کی اپنی! ناچار انجن بند کیا اور اب جو پاؤں باہر رکھا تو محسوس ہوا گویا لیسدار کیچڑ نے پاؤں جکڑ لئے۔ منہ پر سرد ہوا کے تھپڑ اور بوندوں کی یلغار۔ گرتا پڑتا روشنی کے جگنو کی جانب چلا' یوں کہ چند گز چل کر ہانپ گیا اور سردی کے باوجود جسم پسینہ میں بھیگ گیا۔ تیز ہوا گویا قدم اکھاڑنے پر تلی تھی اور کیچڑ گوند میں تبدیل ہو گیا تھا۔ دونوں ہاتھ پھیلا کر توازن قائم کرنے کی کوشش میں وہ کنی کھانے والی پتنگ کی مانند ڈولتا جا رہا تھا اور پھر......

پیشتر اس کے کہ اسے احساس ہوتا وہ یوں منہ کے بل گرا کہ لوہے کی گول کمانی والی عینک گر گئی' اوکڑوں بیٹھ کر تلاش کرنے میں ہاتھ کیچڑ سے بھر گئے۔ سنبھلنے کی کوشش میں تیورا کر گرا۔ منہ ہاتھ بوٹ جرابیں' کپڑے سب کے ساتھ کیچڑ نے ہولی کھیلی' غصہ' خفت' بے چارگی اور نہ جانے کون کون سے احساسات اب اسے رونے پر مجبور کر رہے تھے۔ بہر حال ہاتھوں کے دائروں میں عینک آ ہی گئی۔ کیچڑ بھری عینک ناک پر جمائی تو گندے شیشوں میں روشنی کی کرن چمکی' مگر نہیں یہ بجلی کی چمک نہ تھی روشنی کا مدھم دائرہ سفر میں تھا!

اس کی ریڑھ کی ہڈی سے جو سرد لہر چلی اس نے ہڈیوں تک کا گودا سن کر دیا۔ یقیناً اسے چھلاوؤں نے روشنی دکھا کر پھانسا ہے۔ یہ سیاہ طوفانی راتیں پچھل پائیوں اور راگیا بیتالوں کے لئے چاند کی راتیں ثابت ہوتی ہیں اور چڑیلیں اسی طرح اپنا شکار پھانستی ہیں۔ نہ جانے کس منحوس مقام پر غلط وقت میں پیشاب کر بیٹھا تھا جس کی سزا میں اب بھوت اس کے جسم کو اپنا مسکن بنائیں گے۔ اس احساس سے جسم میں کپکپی کی نئی لہر دوڑ گئی۔ زیادہ زور لگا کر اٹھنا چاہا تو جیسے غیر مرئی ہاتھوں نے قدم تھام لئے۔ مزید زور لگا کر اٹھنا چاہا تو کیچڑ میں جسم نیم دائرہ بنا کر رہ گیا۔ اس نے چندھی آنکھیں کھول کر کیچڑ بھرے شیشوں میں دیکھا تو کیچڑ میں روشنی کے دائرے کو سفر میں پایا اور رخ یقیناً اس کی جانب تھا۔ مارے خوف کے پیشاب خطا ہوا تو سیدھی سی وجہ تھی کہ وہ چند لمحے پہلے مثانہ خالی کر چکا تھا۔ اس نے گھبرا کر پھر سنبھلنا چاہا اور اس کوشش میں رپٹا کھایا۔

......وہ سامنے تھی!

اس کی گھگھی بندھ گئی۔

اس کے قدم روشنی کے دائرہ میں تھے۔ اس نے غور سے دیکھا' سلیپروں میں اس کے پاؤں سیدھے نظر آئے تو اطمینان کی طویل سانس خارج ہوئی۔ سلیپر' شلوار' اس کی نگاہ اوپر ہوتی گئی۔ لالٹین کی روشنی میں وہ اسے دیکھ رہی تھی۔ سر پر بوری کا ٹکڑا تھا اور بوندوں سے بچانے کے لئے لالٹین بوری کے نیچے کر رکھی تھی۔

دونوں ایک دوسرے کو خاموشی سے دیکھ رہے تھے۔ اس نے خاموشی سے ہاتھ بڑھایا۔ اس نے ہاتھ تھام کر ایک جھٹکے سے جو اسے اٹھایا تو گویا کیچڑ نے گھبرا کر قدم چھوڑ

دیئے۔ اس نے ہاتھ چھوڑا تو لڑکھڑا کر گرنے لگا۔

''دیکھ کے۔'' وہ بولی اور دوبارہ ہاتھ تھام لیا۔

''گر گئے تھے؟''

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''چوٹ تو نہیں لگی''

اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

وہ اس کے پیچھے روشنی کے ملگجے دائرہ میں قدم قدم جا رہا تھا۔ وہ ایک چبوترے کے قریب جا کر رکی اور کوٹھڑی کی طرف اشارہ کر کے بولی۔ ''یہ میرا تندور ہے۔''

اس نے ٹاٹ کا پردہ اٹھایا اور سر جھکا کر اندر داخل ہو گیا۔ کمرہ نے اسے گرم بازوؤں میں لے لیا۔

وہ تندور کے کنارے پر اپنی بوری پر براجمان ہو گئی۔ لالٹین کو دھوئیں سے سیاہ کیل سے لٹکا دیا۔ وہ کھڑا آنکھیں جھپک رہا تھا۔ بند کمرہ کی دیواروں سے گرم لہریں کند اعصاب کو سکون کی تھپکیاں دے رہی تھیں۔ یوں کہ جسم پر گرم نرم ہاتھ پھیرنے کا احساس ہو رہا تھا۔ تندور کا سرخ دائرہ شفقت سے اپنی جانب کھینچ رہا تھا۔

''بیٹھ جاؤ نا۔''

وہ خاموشی سے تندور کے کنارے پر بچھی بوری پر بیٹھ گیا۔

دونوں کی آنکھیں ایک دوسرے کا مزید تعارف حاصل کر رہی تھیں۔ تندور کا دائرہ اس تعارف میں گرمی پیدا کر رہا تھا۔ وہ بھاری جسم، پھیلے کولہوں اور بھاری سینے والی لحیم شحیم عورت تھی۔ اسے دیکھ کر یہ احساس ہوتا گویا خمیرہ آٹا پھیل کر پرات سے باہر آنے کو ہو۔ چہرہ کی رنگت اور دھوئیں بھری دیوار میں کوئی خاص فرق نہ تھا۔ اس نے سر پر سے بوری کا ٹکڑا اتار پھینکا اور گرم سیاہ چادر اوڑھنے کو تھی کہ اسے بھیگا چوہا بنا دیکھ کر بولی۔

''او ہو ٹھنڈ لگ رہی ہو گی...... یہ لو!''

اس نے چادر اس کی طرف بڑھا دی۔

''نہیں! نہیں ٹھیک ہے۔''

اس نے دونوں ہاتھ تندور کے دائرے پر پھیلا دیئے۔

''لے لو، سردی لگ رہی ہو گی''

''رہنے دو، میرے کپڑے کیچڑ میں بھر گئے ہیں۔ چادر خراب ہو جائے گی''

اس کے پھیلے بازو حرارت جذب کر رہے تھے۔ اس نے تندور میں بھاڑ جھونکی تو چند ثانیوں کے دھوئیں کے بعد ایک جھٹکے کے ساتھ آگ کی زبان تندور سے باہر لہرائی۔ اس نے گھبرا کر ہاتھ پیچھے کر لئے۔

''چائے پیو گے؟''

اس نے جواب میں گردن ہلا دی۔

اور پھر اس کی بپتا سن کر بولی۔ ''گاڑی تو اب صبح ہی نکل سکے گی! لہٰذا اپنے صاف کپڑے نکال لاؤ۔''

''ہاں یہ ٹھیک رہے گا۔''

''جب تک چائے بھی تیار ہو جائے گی۔''

اس نے وہی بوری کا ٹکڑا سر پر رکھا اور لالٹین لے کر باہر آیا۔ اگرچہ گرم تندور کے پاس سے اٹھنے کو جی نہ چاہ رہا تھا مگر مجبوری تھی۔ مرتا جیتا کار تک پہنچا اور ڈگی سے بمشکل اٹیچی نکالا۔ گاڑی لاک کی اور واپس آ گیا اور واپس آ کر ہی اپنی حالت کا احساس ہوا۔

''میں...... میں کپڑے کہاں بدلوں؟''

اس نے اسے دلچسپی سے دیکھا۔ ''گاڑی میں بدل لئے ہوتے۔''

''خیال ہی نہ رہا۔ چلو اب جا کر بدل لیتا ہوں۔''

''رہنے دو۔ ادھر پیچھے میرا کمرہ ہے وہاں جا کر بدل لو۔''

بند کمرہ کی گرمی میں سو جانے کو جی چاہ رہا تھا۔ اس نے بستر کو دیکھا جو دعوت دے رہا تھا کہ اس پر یوں گرو کہ پھر نہ اٹھو! اس نے تولیہ سے رگڑ رگڑ کر کیچڑ صاف کیا۔ گندے کپڑے بدلے۔ شیشے چمکا کر عینک ناک پر سجائی تو خود کو انسان محسوس کیا۔

باہر آیا تو وہ چائے بنا چکی تھی۔ شیشے کے گلاس کی گرمی ہاتھوں کو بھلی لگ رہی تھی۔ زیادہ چینی اور تیز پتی والی گرم گرم چائے جسم میں حرارت کی لہریں دوڑا رہی تھی۔ اس نے

طمانیت کی طویل سانس چھوڑ دی۔

''ٹھیک ہے؟''

''بہت مزے دار'' اور پھر ہنس کر بولا۔ ''میں شوگر کا مریض ہوں اور میں میٹھی چائے نہیں پیتا مگر اس وقت اس سے بڑھ کر عیاشی کا سوچا بھی نہیں جا سکتا۔'' اس نے چائے کی ایک چسکی لی اور پھر سکون کی ایک اور طویل سانس...... جیب سے سگریٹ نکال کر سلگائی تو پہلے طویل کش نے جو مزہ دیا وہ سب سے انوکھا تھا۔ اس نے دیوار سے ٹیک لگا کر ٹانگیں پھیلا دیں۔

لالٹین کی روشنی میں تندور سے گرمی اگلتے سوراخ کے کنارے دونوں خاموشی سے چائے پی رہے تھے۔ اب یہ یاد بھی نہ رہا تھا کہ باہر یخ ہوا کے تند جھکڑ بوندوں کے ساتھ دھمال ڈال رہے ہیں۔

وہ ہنسا۔

اس نے آنکھیں اٹھا کر اسے دیکھا۔

''میں تمہیں دیکھ کر ڈر گیا تھا۔''

''کیوں؟''

''میں...... میں......'' وہ پھر ہنسا ''سمجھا کہ تم کوئی چڑیل ہو۔''

وہ بھی ہنسی۔ ''اور میں تو باہر اپنے موتی کی تلاش میں نکلی تھی۔''

''موتی؟...... تمہارا میاں......؟''

''نہیں۔'' وہ پھر ہنسی ''میرا کتا ہے نہ جانے شام سے کہاں جا مرا ہے۔''

''اوہ!'' شرمندہ سا ہو کر پھر گلاس کو منہ لگا لیا۔

''میرا یہ مطلب نہ تھا۔'' وہ اس کی شرمندگی کو بھانپ کر بولی۔

''نہیں نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔'' اور پھر موضوع بدلنے کو پوچھا۔ ''یہاں اکیلی رہتی ہو۔''

''بالکل۔'' وہ اطمینان سے بولی۔

''ڈر نہیں لگتا؟''

''کس سے......؟''

''یہ ویران راستہ اور جنگل اُجاڑ......''

وہ ہنسی ''نہ ویران راستہ ہے اور نہ اجاڑ جگہ۔ ذرا فاصلہ پر گاؤں ہے اور ساتھ ہی پکی سڑک...... ہر وقت آنا جانا رہتا ہے یہ تو بارش کی وجہ سے یوں محسوس ہو رہا ہے......''

''مگر پھر بھی یوں اکیلی۔''

وہ ہنسی۔ ''اس سے بھلا کیا ہوتا ہے؟''

اس نے غور سے دیکھتے ہوئے سوچا واقعی اسے کوئی کیا کہہ سکتا ہے۔ وہ قوت اور توانائی کا احساس دلانے والی عورت تھی۔ بھرے بھرے لب اور گوشت سے بھرے بازو، وہ نہ صرف پراعتماد عورت تھی بلکہ اعتماد پیدا کرنے والی بھی تھی۔ میں تو اس کے سامنے بیٹھا چوہا سا لگ رہا ہوں۔ اس نے سوچا یہ لمبی بوتھی، یہ تنکوں کا بنا جسم اور یہ موٹے شیشوں والی عینک لاحول ولا......

چائے ختم کر کے گلاس تندور کے کنارہ پر رکھا تو اس نے پوچھا۔ ''بھوک تو لگی ہو گی۔''

''ہاں۔''

''میں دیکھتی ہوں۔'' یہ کہہ کر اس نے بڑی سی چنگیر پر سے رنگین پھولوں والا دستر خوان اٹھا کر روٹیاں نکالیں اور ہنڈیا میں سے سالن نکال کر تام چینی کی رکابی میں ڈال کر اس کے آگے رکھ دیا۔

''بڑا گوشت ہے'' اس نے جیسے معذرت کی۔

''کوئی بات نہیں۔'' وہ خوشی سے بولا ''آج رات سب چلے گا۔''

''ٹھہرو۔''

اس نے نوالہ توڑتا ہوا ہاتھ روک دیا۔ اس نے ایک دیگچی اٹھائی اور گھی کا چمچہ سالن میں ڈال دیا۔ ''اب کھاؤ۔''

کسی نے پہلی مرتبہ اسے یوں پیار سے کھانا کھلایا تھا۔ نوالہ جیسے حلق میں اٹک گیا اور پیشتر اس کے کہ اسے احساس ہوتا، وہ اسے اپنی کہانی سنا رہا تھا۔

''ہائے ابھی تک شادی نہیں کی۔''

اس نے سر جھکا لیا۔

باہر ہوا شوک رہی تھی اور اندر تندور کے کنارہ وہ ایک اجنبی عورت کو اپنی تنہائی' اپنے دکھ اور اپنے خوف کے بارے میں بتا رہا تھا۔ وہ اس کے چہرہ پر نظریں جمائے بڑے غور سے اس کی باتیں سن رہی تھی۔ آج تک کسی مرد (عورت کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا) نے اس کے ساتھ اپنائیت سے بات نہ کی۔ یار لوگ اس کا مذاق اڑاتے تھے' دفتر کی لڑکیوں کے لئے شاید وہ فرنیچر سے زیادہ حیثیت نہ رکھتا ہوگا اور یہ عورت...... یہ پہلی عورت...... اسے ہمدردی سے کھانا کھلا رہی تھی اور توجہ سے اس کی باتیں سن رہی تھی۔ گویا اس کی اپنی ہو...... باتیں کرتے کرتے دل بھر آیا۔ گلا رندھ گیا اور بات حلق میں اٹک گئی۔

اس نے خاموشی سے برتن اس کی جانب سرکا دیے۔

وہ چپ رہی۔

دونوں نے ایک دوسرے کو آنکھ بھر کر دیکھ۔ اس عورت کے دیکھنے سے عجیب عافیت کا احساس ہو رہا تھا۔ گویا وہ پناہ گاہ ہو۔ اس نے طویل سانس لی!

عورت نے نظروں کی ڈور توڑ کر مزید بھاڑ تندور میں جھونک دی۔ شعلے بلند ہوئے جن کی سرخی کے چہرے پر بھی لہرا گئی۔

''اگر گاڑی نکل سکتی تو میں اب چل دیتا۔''

''یہ تو مشکل ہے۔ اس وقت کون ملے گا۔''

''تو پھر؟''

''رات یہیں سو جاؤ۔''

'' مگر...... مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے!''

وہ محض ہنس دی۔

''میرا مطلب ہے کہ میں......''

'' کچھ فرق نہیں پڑتا''

''مگر پھر بھی......''

''اندر کمرہ میں میرا بستر ہے جا کر سو جاؤ...... سردی میں بھیگے ہو' باہر نکلے تو بخار ہو جائے گا۔''

''اور تم......؟''

''یہاں!''

''یہاں کہاں؟''

اس نے تندور کے کنارے پڑی بوری کی طرف اشارہ کیا۔

''نہیں! نہیں! یہ ٹھیک نہیں۔''

اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''اگر کسی کو یہاں سونا ہی ہے تو پھر میں یہاں سوتا ہوں۔''

''نہیں! تم مہمان ہو۔''

وہ ہنس کر بولی۔ ''جاؤ جا کر سو جاؤ! رات بہت بیت چکی ہے۔''

وہ کمرہ میں داخل ہوا تو بستر کی گرم راحت کے تصور سے ہی جسم میں سکون کی لہریں دوڑنے لگیں' اس نے کمرہ میں آ کر لکڑی کا بڑا سا بکس کھول کر بستر نکالا اور اسے تندور کے پاس بچھایا اور ہاتھ بڑھا کر لالٹین کی بتی نیچے کر دی۔

وہ بستر پر لیٹا بوندوں کی تال پر جھکڑوں کا نغمہ سنتا رہا۔ اندھیرے میں تندور کی آگ کی سرخی سے دیوار کی شفق پر لالٹین کی مدھم لو کا تارہ دمک رہا تھا۔ وہ اس عورت کے بارے میں سوچ رہا تھا جسے وہ پہلے چڑیل سمجھا تھا مگر اب وہ اس سے خوفزدہ نہ تھا۔ وہ ہمیشہ سے ان نرم جسم والیوں سے خوفزدہ رہا تھا۔ اس لئے کہ اس کا قد چھوٹا تھا' وہ منحنی تھا وہ کمزور تھا' وہ پراعتماد نہ تھا' احساس کمتری کا شکار تھا۔ مگر اس عورت نے اسے یوں پُرسکون کر دیا تھا کہ اس نے کتاب زیست کی ورق گردانی شروع کر دی اور یوں سب کچھ اگل کر وہ خود کو ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا گویا اس کی مہمان نوازی کے جواب میں اپنی ذات کی سوغات پیش کر دی۔

نیند آ رہی تھی مگر ٹھنڈ کا احساس نیند پر غالب آ رہا تھا۔ اس نے پہلے پاؤں سکیڑے اور پھر گھٹنے سینے سے لگا دیئے۔ یوں گیند بن کر لیٹنے سے کچھ سکون کا احساس تو ہوا مگر سردی پھر بھی نہ گئی۔ جو اعصاب سن کئے دے رہی تھی اور تھکن کے باوجود نیند کوسوں دور بھاگ چکی

تھی۔اس نے ٹھنڈ سے دھیان ہٹانے کی کوشش کی۔

وہ بیداری اور نیند کی درمیانی حد پر تھا کہ اسے اچانک کمرہ میں گرمی کا احساس ہوا۔اس نے آنکھیں کھول کر دیکھنا چاہا مگر نہیں۔ وہ اس حرارت کو پوری طرح جسم میں جذب کرنا چاہتا تھا۔غالباً سورج سوا نیزے پر آ گیا تھا۔سورج کمرہ میں آ گیا تھا اور سورج بستر میں تھا کمرہ حرارت میں جل رہا تھا۔اس کا بستر جل رہا تھا۔اس کا جسم جل رہا تھا۔ایسی آگ جسے پسینہ بھی سرد نہ کر سکے۔وہ رضائی سے بے نیاز ہو چکا تھا اس کا اپنا جسم گرمی کا منبع بن چکا تھا۔وہ خود سورج بن چکا تھا۔وہ سورج بن کر بلند ہو رہا تھا اور بلند، بلند تر......اور اب وہ نصف النہار پر تھا۔صبح آنکھ کھلی تو کچھ نہ سمجھ سکا......خواب تھا یا خیال تھا۔کیا تھا!

وہ تندور جلائے بیٹھی تھی۔''لو چائے پیو!'' وہ خاموشی سے اس کے پاس بیٹھ گیا اور دونوں ہتھیلیوں میں چائے کا گلاس تھام کر چائے پینے لگا۔

وہ بولی۔''ابھی آدمی آ جائیں گے اور گاڑی نکال دیں گے۔''

وہ اسے خاموشی سے دیکھتا رہا۔

''کیا دیکھ رہے ہو؟''

پیشتر اس کے کہ اسے احساس ہوتا اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے وہ اس کے قریب ہو گئی۔''کیوں؟''

اس نے اپنا سر اس کے کندھے پر رکھ دیا۔

''کیا بات ہے؟''

وہ خاموش رہا۔

''کیوں روتے ہو؟''

''کچھ نہیں!'' اس نے آنکھیں پونچھیں۔''میں جب بہت زیادہ خوش ہوتا ہوں تو رونے لگتا ہوں۔''

وہ اس کے گال پر پیار سے چپت مار کر بولی۔''چل جھوٹے!''

O.....O.....O

بن آتما

راجہ کا منہ کھلا رہ گیا۔اس نے کچھ کہنا چاہا مگر خشک حلق میں جیسے تھوہر اگ گئے۔ اس نے بمشکل بے ترتیب سانسوں کو مرتب کیا اور آہستگی سے بولا۔''کیا کہہ رہے ہو؟''

مہامنتری کا ادب سے جھکا ہوا سر اور بھی جھک گیا۔

''راجن! میری کئی پشتیں آپ کی خدمت میں زندہ رہی ہیں اور آپ کے مان پر مری ہیں۔یقین مانئے میں غلط بات نہیں کہہ سکتا۔''

''مگر اتنی بڑی بات؟'' راجہ جھرجھری لے کر بولا۔

مہامنتری دونوں ہاتھ جوڑ کر بولا۔''بات واقعی بڑی ہے مگر یہ سب ان آنکھوں کا دیکھا ہے۔'' راجہ گہری سوچ میں تھا۔مہامنتری بولا۔''غلط دیکھنے کی سزا میں میری آنکھیں نوچ کر تلوؤں سے مسل دیجئے۔'' راجہ نے اسے آنکھ بھر کر دیکھا تو مہامنتری کے چہرہ پر جہاں اندیشوں کی راکھ تھی وہاں آنکھوں میں سکون کے دو دیپ بھی روشن تھے۔ایسے دیپ کہ اندیشوں سے ان کی لو میں کپکپاہٹ نہ تھی۔راجہ نے نظریں جھکا لیں۔

مہامنتری بولا۔''آگیا ہو تو عرض کروں؟''

''ہوں'' راجہ نے جیسے بے خیالی میں کہا۔

مہامنتری کہنے لگا۔''راجن آپ اس دن سے شروع کیجئے جب آپ پہلی مرتبہ ملے تھے۔'' مہامنتری جان بوجھ کر نام نہ لے رہا تھا۔شاید وہ خوفزدہ تھا کہ زبان سے نام لے دینا ہی پاپ نہ بن جائے!

راجہ کیسے بھول سکتا تھا وہ دن!

وہ ایسا البیلا اور چمکیلا دن تھا کہ من میں خود بخود تراوٹ بیدار ہو۔ نہ اتنا گرم کہ ہر دہ نڈھال ہو اور نہ اتنا سرد کہ تن کپکپا اٹھے...... کانٹے کی تول کا دن تھا وہ...... گگن کے نیلے روپ میں بادل کے سفید ٹکڑے اضافہ کر رہے تھے۔ چیت کا وہ دن عجب مستی کا پیالہ تھا کہ پیے جاؤ پیالہ بھرا ہوا۔ اس لئے راجہ کا من پنچھی بھی جیسے باؤلا ہو گیا۔

اگرچہ راجہ عادت کے مطابق راج کا کام کرتا پرجا کے دکھ دور کرتا، مجرموں کو سزا دیتا لیکن کچھ عرصہ سے وہ یوں محسوس کر رہا تھا، جیسے کسی چیز کی کمی ہو۔ کہیں نہ کہیں ایک آنچ کی کسر رہ گئی ہو۔ ذہن جیسے کسی خواب کی راحت یاد کرتا مگر یاد نہ کر پاتا۔ کسی نغمے کا ٹکڑا پنچھی کی مانند تن نگر سے تیزی سے پرواز کر جاتا مگر یاد کے دام میں نہ آتا۔

راجہ اتنا بیاکل ہوا کہ اپنی رانیوں سے بھی بیزار بیزار سا رہنے لگا۔ چیت کے اس سندر دن اجلی دھوپ اور پروائی نے من میں وہ آندھی اٹھائی کہ راجہ سے رہا نہ گیا۔ مہامنتری کو بلایا۔ شاہی لباس اتار، پرجا کا لباس پہن گھوڑے پر سوار، جنگل کی راہ لی۔

جنگل میں ہریالی کا راج تھا۔ پتے کبھی اتنے سبز نہ لگے تھے پھول کبھی اتنے سرخ نظر نہ آئے تھے۔ درختوں کے تنوں نے یوں کبھی گردن نہ اٹھائی تھی اور نہ کبھی پیڑوں نے یوں بازو پھیلائے تھے کہ گویا خود میں سما جانے کی دعوت دے رہے ہوں۔ فضا میں عجب ٹونا تھا اور بے سدھ راجہ جنگل کے چھتر میں مست تھا۔ مہامنتری دونوں گھوڑے سنبھالے راجہ کے پیچھے پیچھے حیران چلا جا رہا تھا کہ مہاراج کدھر جا رہے ہیں۔ اسے اس دم بدم گھنے جنگل کی بڑھتی ٹھنڈک سے انجانا خوف محسوس ہو رہا تھا۔ اسے درختوں کی پھیلی شاخیں اپنی جانب بڑھتی انگلیاں لگ رہی تھیں۔ درختوں سے لپٹی بیلوں کو وہ کوڑیالے کی مانند شوکتا محسوس کر رہا تھا جنگل عجب باس دے رہا تھا اور اس کی نم آلود ٹھنڈک جسم پر مردار ہاتھ کے چپچپاتے لمس کی مانند تھی۔

مہامنتری کے جسم کی لرزش نے اعصاب میں لہریئے ڈال دیئے، چلتے چلتے گھوڑے بعض اوقات ٹھٹھک کر رک جاتے اور وہ باگ پکڑ کر انہیں کھینچتا۔ اس نے تلوار کے قبضہ پر ہاتھ رکھا تو فولاد کی سخت ٹھنڈک نے ڈھارس بندھائی۔ وہ بزدل نہ تھا اور نہ ہی مرنے

مارنے سے ڈرتا تھا اسے اگر ڈر تھا تو مہاراج کا...... اسے اپنی جان کی پرواہ نہ تھی۔ جنگل کا یہ بے نام خوف اسے ٹھنڈا کئے جا رہا تھا۔ مگر خوف کس بات کا......؟ جنگل سے خوف کیوں؟ ہاں کیوں خوف؟ کیسا خوف؟ اور تب اسے احساس ہوا کہ جنگل بالکل خاموش ہے۔ حیوانوں اور پرندوں کی آوازوں سے یکسر خالی، کسی جانور کی آواز سے قطعی طور پر محروم۔ دراصل یہ گمبھیر خاموشی ہی اسے ڈرا رہی تھی۔ اتنا بڑا جنگل اور اس میں کوئی بھی جانور نہ ہو، اتنے بڑے بڑے پیڑ اور ان پر کسی بھی پرندے کا گھونسلا نہ ہو۔ اتنی ڈالیاں اور ان پر کوئی پنچھی نہ چہچہائے۔ یہ کیسا جنگل ہے؟ مہامنتری نے جھرجھری لے کر چاروں اور پھیلے اس گونگے جنگل کو دیکھا اور احتیاطاً تلوار نکال لی۔ وہ ہر قیمت پر اس بھید بھرے جنگل سے اپنے راجہ کی رکھشا کرنا چاہتا تھا۔

ادھر راجہ یوں محسوس کر رہا تھا گویا نظر نہ آنے والی ڈور اسے اپنی جانب کھینچے جا رہی ہو۔ وہ خود بھی نہیں جانتا تھا کہ وہ اس رات سماں جنگل میں کیوں بڑھتا جا رہا ہے۔ اس نے پیچھے چلتے مہامنتری کے تلوار نکالنے کی آواز سنی پھر گھوڑوں کے ہنہنانے کی آوازیں سنیں جن میں خوف کی لرزش واضح تھی۔ پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر ہی اسے یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ مہامنتری اور گھوڑے دونوں خوفزدہ ہیں اور وہ یہ بھی جانتا تھا کہ یہ دونوں آسانی سے ڈرنے والے نہیں۔ جنگل کا جادو محسوس کرنے کے باوجود بھی وہ خوفزدہ نہ تھا بلکہ عجب پیاس تھی کہ نادیدہ چشمے کی طرف کھینچ رہی تھی۔

راجہ کیسے بھول سکتا تھا وہ سندر نار۔

وہ ٹھٹھک کر رک گئے...... سامنے کنول بھرا تالاب تھا۔ گہرے سبز اور چوڑے چوڑے پتوں بیچ سرخ کنول چمک رہے تھے۔ تالاب کا شفاف پانی، سبز پتے اور سرخ کنول یہ سب آنکھوں میں ٹھنڈک کے کٹورے انڈیل رہے تھے۔ تلوار تھامے مہامنتری خاموش تھا۔ گھوڑے ساکت تھے، درخت، شاخیں، پتے، ہوا سب بے حرکت تھے۔ جیسے سانس روکے ہوں!

جنہیں وہ سفید کنول سمجھا تھا جب وہ سرخ کنولوں سے الگ ہوئے تو راجہ کے سینے میں رکی سانس خارج ہوئی۔ آنکھ بھر کر دیکھا تو محسوس ہوا گویا اوشا اشنان کر رہی ہو۔

پانی سے یوں باہر نکلی جسے لہر نے ناری روپ لے لیا ہو۔ کنول بھرے تالاب میں چندرماں کی طرح دمک رہی تھی۔ بالوں سے پانی کی ٹوٹتی بوندوں میں دھنک رنگ لہرا رہے تھے۔ مگر انگ پر بوند نہ ٹکتی۔

وہ اب تک ان کی موجودگی سے بے خبر تھی۔ راجہ اور منتری دونوں چتر بنے کھڑے تھے، گھوڑے گویا سانس نہ لے رہے تھے، جنگل، ہوا، سب چپ!

اور تب پہلی مرتبہ اسے ان کی موجودگی کا احساس ہوا۔ ادھر لاج سے ہاتھ اٹھا ادھر راجہ کی آنکھوں میں دو کنول نین ڈوب گئے۔ یوں کہ راجہ لڑکھڑا گیا۔

وہ مینکا تھی کہ شکنتلا؟ وہ جو بھی تھی واپسی میں راجہ کے ساتھ تھی!

راجہ کیسے بھول سکتا تھا وہ مدھ بھرا دن، راجہ کیسے بھول سکتا تھا وہ بھید بھرا جنگل اور راجہ کیسے بھول سکتا تھا وہ جل اپسرا! وہ تھی تو جل اپسرا مگر اس کے تن کی جوالا میں اشنان سے راجہ نے نئی شکتی پائی اور نئی مدھرتا کا مزا چکھا تو آتما کو شانت پایا!...... تو راجہ کیسے بھول سکتا تھا وہ دن راجہ کیسے بھول سکتا تھا وہ جنگل اور راجہ کیسے بھول سکتا تھا وہ نار؟

مہامنتری نے بے چینی سے پہلو بدلا، دونوں ہاتھ جوڑے اور بولا۔ ''مہاراج اسے یہاں آئے کتنے چاند بیت گئے؟''

''چھ!''

راجہ کو گنتی کی ضرورت نہ تھی وہ جواب جانتا تھا۔ سب یہی سمجھتے تھے کہ باگھ آتا ہے اور گائے، بیل، بھینس، بچھڑا، گھوڑا جو بھی ہاتھ لگے چٹ کر جاتا ہے۔ یوں کہ ہڈیاں بھی نہ ملیں۔

''تم کہنا کیا چاہتے ہو۔'' راجہ نے پوچھا تو آواز میں لرزش تھی۔

''مہاراج......'' مگر مہامنتری کے منہ سے بات نہ نکل رہی تھی۔

راجہ اسے متوقع نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

وہ ہاتھ جوڑ کر تیزی سے یوں بولا جیسے ایک سانس میں سب اگل دینا چاہتا ہو۔ ''مہاراج! یہ وہ نہیں جو آپ سمجھ رہے تھے۔''

''کیا؟''

''جی مہاراج''

''تم کیا کہنا چاہتے ہو مہامنتری؟''

وہ پھر ہاتھ جوڑ کر بولا۔ ''ہماری نسلوں نے آپ کی نسلوں کی سیوا کی ہے۔ میں جھوٹ نہ بولوں گا......'' وہ ایک لحہ کو پھر غوطہ لگا دینے والے انداز میں بولا۔

''مہاراج، یہ عورت نہیں۔ ناری کے روپ میں کچھ اور ہی ہے۔'' وہ لرز کر چپ ہو گیا۔ راجہ نے نظر بھر کر دیکھا تو مہامنتری کو خوفزدہ پایا اور راجہ جانتا تھا کہ وہ آسانی سے ڈرنے والوں میں سے نہیں۔ ''کہے جاؤ۔'' وہ کندھے پر ہاتھ رکھ کر نرمی سے بولا۔ ''مجھے تم پر بھروسہ ہے۔''

''مہاراج جانتے ہیں کہ اب ان جنگلوں میں باگھ، چیتا اور تیندوا قسم کا کوئی جانور نہیں رہا۔''

''ہاں یہ تو ہے۔''

''اس لئے جب مسلسل جانور اور پھر لوگ غائب ہونے لگے تو مجھے شک ہوا کہ شاید راج کا کوئی دشمن یہ سب کچھ کر رہا ہے کہ پرجا بے چین ہو کر بھڑک اٹھے۔ چنانچہ میں نے راتوں کو کھوج لگانا شروع کر دیا مگر کچھ بھی ہاتھ نہ آیا۔'' وہ ایک لحہ کو رکا تو دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں۔

''مہاراج! تب مجھے یاد آیا کہ وہ کن حالات میں ہمیں ملی تھی...... بے لباس اور بے سہارا، پھر اس کا آپ کے ساتھ خوشی خوشی چلے آنا! تو میں کچھ مشکوک ہو گیا۔ پھر میں نے حساب کیا کہ محل میں اس کی آمد کے بعد ہی سے یہ سلسلہ شروع ہوا تھا۔ مہاراج اگر یاد کریں تو جس رات یہ محل میں آئی اس رات ایک باندی کا بچہ گم ہوا تھا۔''

راجہ کو یاد تھا۔

''تب مہاراج میں نے باہر گلیوں اور کھیت کھلیان چھوڑ کر محل کی نگرانی شروع کی۔ میں ہر رات محل کے مختلف حصوں میں چھپ کر بیٹھتا مگر کچھ معلوم نہ کر سکا اور تب کل رات۔''

وہ جھجک کر خاموش ہو گیا۔

وہ رات!

اور کیسے بھول سکتا تھا مہا منتری وہ رات!

وہ جیالا مرد تھا مگر اس رات خوف سے وہ یوں ڈسا گیا کہ ہمیشہ کے لئے ٹھنڈا ہو کر رہ گیا۔ اماوس کی رات کالی گھٹا بن کر گھر آئی تھی۔ وہ راجہ کی خواب گاہ کے سامنے تاریک رات میں تاریکی کا سایہ بنا کھڑا تھا۔ نگاہیں خواب گاہ پر مرکوز کئے' جہاں ابھی تک روشنی تھی۔ پھر یہ روشنی بجھ گئی۔ وقت اور تاریکی ہاتھ میں ہاتھ دیئے گزر رہے تھے۔ مسلسل گھورنے سے آنکھیں درد کر رہی تھیں۔ آسمان دیکھا تو کہکشاں سر سے ہٹ کر آسمان کے کنارے پر نظر آئی۔ اس نے اندازہ لگایا کہ تقریباً پون رات بیت گئی ہے۔ خواب گاہ کے باہر پہرہ دار نیند میں گہری سانس لے رہے تھے۔ صرف ان کے سروں پر مشعلیں جلتی رہ گئی تھی۔ اس نے دل کو خوف کی مٹھی میں پایا تو ہاتھ تلوار کے قبضہ پر مضبوط ہو گیا۔

دروازہ کھلا اور وہ چوکھٹ پر تصویر کی طرح نظر آئی۔ ہوا سے ہلتی مشعلوں نے اس کے چہرہ پر روشنی اور سائے کی لیلا رچائی تھی۔ مشعل کی زرد روشنی میں وہ بے حد کمزور اور نڈھال دکھائی دے رہی تھی گویا برسوں کی مریض ہو۔ وہ چلی تو یوں لگا جسم کی ہڈیاں آپس میں ٹکرا کر آواز پیدا کر رہی ہوں۔ وہ عورت کی طرح نہیں بلکہ کسی ڈھانچہ کی مانند اچھل اچھل کر چل رہی تھی اور پھر غلام گردش کے اندھیرے نے اسے نگل لیا مگر مہا منتری بھی تاریکی کا سایہ بنا پیچھے پیچھے تھا۔ وہ تاریکی اور نیند میں ڈوبے محل کی سنسان غلام گردشوں سے ہوتی ہوئی شاہی اصطبل کی جانب جا رہی تھی اور بڑی تیزی اور بے چینی کے عالم میں!

وہ اچانک رک گئی' گویا آہٹ لے رہی ہو' مہا منتری نے سانس روک لی' مگر دوسرے لمحہ اس نے شاہی اصطبل جانے کا راستہ ترک کر کے زنان خانہ کا رخ کیا۔ وہ آہستگی سے ہر دروازہ دھکیلتی مگر جب بند پاتی تو دوسرے کا رخ کرتی اور پھر بالآخر اسے ایک دروازہ کھلا مل گیا۔ وہ اس تیزی سے اندر گئی اور باہر آئی کہ مہا منتری کی سانس رکی ہی رہی۔

اس کے بازوؤں میں خوابیدہ بچہ تھا۔ وہ جیسے بھوک سے دیوانی ہو رہی تھی۔ چنانچہ وہیں دہلیز پر بیٹھ کر اس نے بچہ کی شہ رگ میں اپنے دانت گاڑ دیئے' بچہ ایک دم کو

کسمسایا مگر اس کی مضبوط گرفت میں ساکت ہو کر رہ گیا۔ وہ جیسے جیسے خون پیتی گئی مرجھائے گالوں کی شام پر سرخی طلوع ہوتی گئی اور جلد ہی سب ختم...... خون' گوشت' ہڈیاں سب ختم۔ اور یہ سب کچھ یوں کھایا کہ آواز دہلیز کے اس پار سوئی ماں کو نہ جگا سکی۔

تب مہا منتری نے اپنی آنکھوں کے سامنے اسے نیا شریر پہنتے دیکھا۔ وہ دوبارہ من موہنی سندر نار بن چکی تھی۔

مہا منتری خاموش کھڑا کانپتا رہا۔ جیسے وہ اب اپنے راجہ کے سامنے کانپ رہا تھا۔ ''دیوتا کی سوگند مہاراج! ایک شبد بھی جھوٹ نہیں۔''

''مجھے یقین ہے۔'' راجہ بولا تو نہ جانے اس کی آواز کس اندھے کنویں سے آ رہی تھی۔ ''مگر اب اس کا اپائے کیا ہو؟''

''مہاراج میں نے بھی بہت وچار کیا۔ بس یہی سمجھ میں آیا کہ مہا پجاری سے بات کی جائے ایسے معاملوں کو وہ ہم سے بہتر سمجھ سکتے ہیں۔''

سب سن کر پجاری غصہ سے بولا۔ ''مہاراج آپ اتنے بدھی مان ہیں مگر آپ نے یہ کیوں نہ سوچا کہ یہ نار بن آتما بھی تو ہو سکتی ہے۔''

''مطلب؟''

''مہاراج! جیسے ہم پرشوں میں آتما ہے' گئو میں پوتر آتما ہے۔ سوریہ اور چندر مان میں دمکتی آتما ہے۔ جل میں مچلتی آتما ہے۔ اسی طرح بن آتما بھی ہوتی ہے۔ آپ کو اس کالا بھ نہیں کرنا چاہئے تھی اور نہ ہی بھوگ۔ اس سے دور رہنا چاہئے تھا۔''

''اب تو سب ہو چکا پجاری جی۔'' مہا منتری نے کہا

''اس لئے اپائے بتایئے'' راجہ بولا۔

مہا پجاری کی پیشانی پر شکنیں ابھر آئیں۔ ''پرانے بھوج پتروں میں ایسے منتر مل جاتے ہیں جن سے اس کا اپائے ہو سکتا ہے آپ جا کر ہون کنڈ کا پربندھ کریں میں آ کر جاپ شروع کرتا ہوں۔''

اگلے دن ابھی اوشا آسمان پر براج رہی تھی کہ ہون کنڈ کے شعلے بلند ہو گئے۔ مہا پجاری نے اشنان کیا۔ جنیو کو ٹھیک کیا۔ گیندے کو پھولوں کے ہار پہنے اور تلسی کی شاخیں ہاتھ

میں لے کر اس نے ہون کنڈ کے کنارے بیٹھ کر جاپ شروع کیا۔ جیسے جیسے شعلے بلند ہوتے گئے جاپ میں بھی تیزی آتی گئی۔ پرجا دائرہ کی صورت میں ہاتھ باندھے خاموش کھڑی تھی۔ مہامنتری ساکت شعلوں کی زبانیں دیکھ رہا تھا۔ راجہ سر جھکائے بیٹھا تھا اور پھر اچانک وہ دھڑام سے گر گیا۔ منتر کا جاپ رک گیا۔ مہا پجاری اسے تشویش بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ مہامنتری نے آگے بڑھ کر اٹھایا تو راجہ کا پنڈا تپ رہا تھا اور جسم پسینہ میں بھیگ رہا تھا۔

''مہاراج! آپ ٹھیک تو ہیں۔''

''ہاں میں ٹھیک ہوں۔''

مہامنتری اور مہا پجاری نے چونک کر راجہ کو دیکھا جس کی کڑک دار آواز اب عورت کی آواز میں تبدیل ہو چکی تھی۔

O.....O.....O

آخری شعبدہ

جب اس نے چاقو نکالا تو وہ بالکل پرسکون تھا' صرف اس کی پرعزم آنکھوں میں مقصد کی چمک دیکھی جا سکتی تھی ادھر خوبصورت لڑکی بھی خوفزدہ ہوئے یا گھبرائے بغیر ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھی' بلکہ ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی اور آنکھیں چاقو کی دھار پر مرکوز تھیں' وہ پلکیں جھپکائے بغیر اپنی جانب بڑھتے چاقو کو دیکھ رہی تھی۔ شاید اس کی سانس رکی تھی' وہ خوف سے پتھر ہو چکی تھی یا پھر وہ قطعی طور پر لاپرواہ تھی۔ کچھ کہا نہیں جا سکتا۔

اور پھر وہ چاقو اس کے پیٹ میں گھونپ دیتا ہے۔ خون کا فوارہ ابلتا ہے اور وہ کراہے بغیر گر جاتی ہے' وہ ایک لمحہ کو اسے اس مصور کی مانند دیکھتا ہے جو تکمیل کے بعد اپنے شاہکار پر آخری تنقیدی نگاہ ڈالتا ہے۔ اس کے بعد وہ ہاتھ بڑھا کر اسے اٹھنے میں مدد دیتا ہے۔

تالیوں کی گونج میں دونوں ناظرین کے سامنے جھکتے ہیں تو ان کے چہروں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ بلاشبہ وہ بڑا شعبدہ باز تھا۔ اتنا عظیم کہ دوسرے شعبدہ باز اس کے فن کی قسم کھاتے تھے۔ شعبدہ بازوں کی دنیا میں ہُڈنی سے بڑا کوئی اور نام نہ تھا مگر اب اس کے بارے میں یہ طے تھا کہ ہُڈنی سے بھی بڑا فنکار ہے۔

اس نے زندگی شعبدہ بازی کے لئے وقف کر رکھی تھی۔ جہاں دوسرے شعبدہ بازوں کا فن ختم ہوتا' وہاں سے اس کے کارناموں کا آغاز ہوتا تھا۔ اسے ہمیشہ خوب سے خوب تر کی جستجو رہتی تھی۔ اس کے شعبدے اتنے مکمل' سچے اور فنکارانہ انداز سے پیش کئے

جاتے کہ ناظرین دنگ رہ جاتے' آنکھیں دیکھ رہی ہوتیں مگر عقل توضیح نہ کر پاتی۔ بلاشبہ وہ شعبدہ کو معجزہ بنا دیتا تھا۔

وہ ڈولی کا ریشمی پردہ اٹھاتا ہے تو اندر سے سرخ جوڑے میں ملبوس دلہن برآمد ہوتی ہے' جھومر' ٹیکا اور نتھ پہنے' مہندی لگے ہاتھوں سے آداب بجالاتی ہے وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے دو قدم ہی چلاتا ہے کہ سب کی نگاہوں کے سامنے وہ گلدستہ میں تبدیل ہو جاتی ہے سرخ گلاب کے تازہ کھلے پھولوں کا گلدستہ۔ وہ اسٹیج سے اتر کر ہال میں آجاتا ہے اور ناظرین میں پھول تقسیم کرتا جاتا ہے۔ خواتین کے جوڑے میں پھول لگاتا ہے تو مردوں کے کوٹ میں اور جب وہ آخری پھول ایک بچی کو دے کر اسٹیج پر چڑھنے کے لئے مڑتا ہے تو کیا دیکھتے ہیں کہ مرکزی دروازے سے دلہن اندر داخل ہو رہی ہے۔ اسکے ہاتھ میں وہی گلاب کے پھولوں کا گلدستہ ہے۔ عورتیں گھبرا کر جوڑوں پر ہاتھ مارتی ہیں مگر وہاں پھول موجود ہیں۔

الغرض ایسے ایسے شعبدے تھے کے ناظرین تالیاں بجاتے بجاتے تھک جاتے مگر تشفی نہ ہوتی...... اس نے زندگی تکمیل فن کے لئے وقف کر رکھی تھی اور وہ ہر وقت نیا سے نیا اور حیران کن شعبدہ تخلیق کرنے میں لگا رہتا۔ کہانی کار' شاعر یا مصور کی مانند وہ بھی یقیناً تخلیق فنکار تھا۔ جس طرح کہانی کار اور شاعر الفاظ اور استعاروں کے شعبدے دکھاتے ہیں اور مصور رنگوں کے بالکل اسی طرح وہ بھی آنکھ کے لئے حیرت کے مناظر کی تخلیق کرتا تھا۔ وہ خود کو ایک فن کار سمجھتا تھا اور اسی لئے اس نے دیگر شعبدہ بازوں کی طرح نہ تو خود کو جادوگر' میجک ماسٹر یا پروفیسر کہلوانا پسند کیا اور نہ ہی سیاہ واسکٹ پر خریدے ہوئے چاندی کے میڈل سجاتا۔ یہاں بھی اس کی انفرادیت تھی کہ وہ ہر شو کے مخصوص مزاج کے مطابق لباس پہنتا' اسٹیج پر اس کی آمد کا انداز بھی جداگانہ ہوتا۔ وہ روائتی طور پر اسٹیج کے بغلی دروازہ سے نہ داخل ہوتا بلکہ اس دھج اور انداز سے کہ بعض اوقات تو اس کی آمد بھی ایک شعبدہ لگتی۔ وہ شو کے دوران ناظرین سے دلچسپ اور شوخ گفتگو بھی کرتا جاتا۔ ایسی گفتگو کہ ناظرین ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو جاتے۔

الغرض! تنوع اس کے فن کی بنیاد تھا' خوب سے خوب تر کی جستجو مطمع نظر اور شعبدہ

کو معجزہ بنا دینا مقصد حیات!

اور پھر ایک دن بڑے بڑے اخبارات میں اشتہار چھپے' دیواروں پر بڑے بڑے پوسٹر اور لاؤڈ سپیکروں سے گلی گلی میں یہ اعلان کرایا گیا کہ اس مرتبہ وہ ایسا سچا شعبدہ پیش کرے گا کہ حقیقت سے بڑھ کر حقیقی ثابت ہوگا۔ یہ آخری شعبدہ ہوگا کہ اس مکمل ترین شعبدہ کے بعد وہ شعبدہ بازی ترک کر دے گا اور یہ کہ دنیا بھر کے شعبدہ بازوں کو اس کا چیلنج ہے کہ کوئی شعبدہ باز بھی نہ تو ایسا شعبدہ دکھا سکتا ہے اور نہ ہی مستقبل میں دکھانے کا سوچ سکے گا۔

الغرض! آخری شعبدہ کی اتنی تشہیر ہوئی کہ تمام شہر میں اس کا چرچا تھا۔ اس مرتبہ یہ شو مفت تھا۔ اس لئے آخری شعبدہ دیکھنے سارا شہر امڈ آیا۔ یوں کہ بے حد وسیع پنڈال بھی گویا سکڑ گیا تھا۔ سامعین نے دیکھا کہ آج سٹیج کا انداز بھی بدلا بدلا سا ہے۔ پہلے تو سیاہ یا گہرے نیلے رنگ کے پردے ہوتے تھے اور بالعموم اسٹیج نیم تاریک ہوتا تھا' صرف سنگل' اسپاٹ لائیٹ سے شعبدہ اجاگر کیا جاتا تھا' مگر اب اسٹیج روشنیوں میں نہا رہا تھا۔ ایک غیر روائتی جدت یہ تھی کہ وہ شعبدہ بازوں کے برعکس عام لباس میں ملبوس تھا۔ اسٹیج بھی بالکل خالی تھا۔ نہ میز نہ اس پر دھری تاش کی گڈی' نہ وہ سیاہ لمبی ٹوپی جس سے وہ کبوتر نکالتا تھا اور نہ وہ بوتل جسے الٹا کر دینے کے باوجود بھی اس میں سے پانی نہ گرتا تھا۔ اس کا وہ کبوتر بھی غائب تھا جس کے کان میں سے وہ یکے بعد دیگرے انڈے نکالتا جاتا تھا اور وہ خوبصورت لڑکی بھی نہ تھی جسے ایک الماری میں بند کر کے وہ اس میں نصف درجن تلواریں ڈال دیتا تھا۔

تنہا اسٹیج پر روشنیوں میں وہ تنہا کھڑا تھا۔ اس نے نگاہیں اٹھائیں تو سر ہی سر دکھائی دیئے' تب وہ یوں گویا ہوا۔

''معزز خواتین و حضرات! میں نے تمام عمر آپ حضرات کا دل بہلانے میں بسر کی ہے اور ہمیشہ نیا سے نیا شعبدہ پیش کرنے کی کوشش کی اور آپ معزز خواتین و حضرات کی سرپرستی سے اس میں ہمیشہ کامیاب رہا ہوں۔'' تالیوں کے شور میں وہ ایک لمحہ رکا۔ سب کی نظریں اس پر تھیں۔ اس کے بعد اس نے چند ایسے شعبدوں کا تذکرہ کیا

جو نا قابل یقین ہونے کی حد تک حیرت زدہ کر دینے والے تھے۔ اس پر سامعین نے تالیاں بجا بجا کر گویا اس کی تائید کی اس نے ایک مرتبہ پھر سامعین کو دیکھا اور ہر ایک نے یوں محسوس کیا کہ یہ نظر صرف اسی کے لئے تھی وہ طویل سانس لے کر بولا۔ ''اگر چہ مجھے آپ کی توجہ اور سر پرستی حاصل تھی اور آپ کی مسلسل عنایت ہی میری زندگی کا سرمایہ رہی ہے (پرشور تالیاں) اور اگر میری کوئی عزت ہے تو وہ اسی شعبدہ بازی کی بنا پر ہے (مزید تالیاں) تاہم آہستہ آہستہ اس شعبدہ بازی کی بے معنویت کا احساس بڑھتا گیا۔ جیسے جیسے میرا فن مکمل ہوتا گیا مجھ میں اکتاہٹ بڑھتی گئی کہ ہر معجزہ نما شعبدہ کے بعد اس کے بیکار ہونے کا تلخ احساس بڑھ جاتا۔'' وہ پھر رکا سامعین سانس روکے یہ گفتگو سن رہے تھے۔ شعبدہ باز جس راز سے پردہ اٹھا رہا تھا' وہ بذات خود ایک شعبدہ معلوم ہوتا تھا۔ اس نے بات جاری رکھی۔ ''جیسے جیسے فن میں پختگی آتی گئی ویسے ویسے ہی شعبدہ کو معجزہ بنا دینے کا جذبہ شدید سے شدید تر ہوتا گیا اور ساتھ ہی ان سب کے بے معنی ہونے کا احساس بھی بڑھتا گیا۔ معزز سر پرستو! میرا فن ہی میری زندگی ہے اور یہ زندگی تکمیل فن کے لئے وقف کر رکھی ہے۔ لہٰذا فن کی بے معنویت کا مطلب ہے زندگی کی بے معنویت اور یوں جب زندگی بے معنی ہو جائے تو پھر فن بھی اس میں معنی نہیں بھر سکتا۔ خصوصاً اس وقت جب اپنے فن کی بے معنویت کا آسیب بھی ذہن پر مسلط ہو۔'' اس نے ایک مرتبہ پھر سامعین کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا اور یہ اعلان کیا۔ ''اس لئے میں نے خودکشی کا فیصلہ کر لیا ہے۔''

اس پر سامعین خوب ہنسے اور سب نے تالیاں اور سیٹیاں بجا کر اظہار پسندیدگی کیا۔ یقیناً وہ کوئی انوکھا شعبدہ پیش کرنے والا تھا سب اس کی اس عادت سے آگاہ تھے کہ وہ شعبدہ کو حقیقت سے قریب تر کرنے کے لئے اسے زیادہ سے زیادہ ڈرامائی رنگ دینے کی کوشش کرتا تھا۔ یہ سوچ کر سب نے مزید تالیاں بجائیں۔

تالیوں کی گونج میں شعبدہ باز نے پستول نکالی اور یوں گویا ہوا۔ ''معزز ناظرین! یہ اصلی پستول ہے اور یہ دیکھئے میں اس میں اصلی گولیاں بھر رہا ہوں۔'' اور سامعین سے مخاطب ہوا۔ ''جو صاحب چاہیں آ کر اطمینان کر سکتے ہیں۔''

دو تین مردوں نے اسٹیج پر جا کر اطمینان کر لیا کہ واقعی پستول اور گولیاں اصلی ہیں اور کم از کم ان میں کوئی شعبدہ بازی نہ تھی۔ وہ کنپٹی پر پستول رکھ کر ان سے یوں مخاطب ہوا۔

''اچھا تو معزز سر پرستو! خدا حافظ' معزز خواتین و حضرات! آخری سلام...... یہ ہے میرا بہترین' مکمل ترین اور آخری شعبدہ!''

شعبدہ باز پرشور تالیوں میں پستول کی لبلبی دبا دیتا ہے۔

O.....O.....O

روشن دن کا تاریک رات میں سفر

عجب سا ماحول تھا گویا تاریکی اور اجالا مل رہے ہوں یا پھر گلے مل کر جدا ہو رہے تھے۔ سایوں نے عجب پراسرار شکلیں اختیار کر رکھی تھیں۔ کبھی وہ سیاہ گھٹاؤں کی طرح جھومتے ہاتھی بن جاتے تو کبھی جانور' لگڑ بگا' اود بلاؤ' نیولا۔ روشنی ملگجے آنچل کے سوراخوں کی طرح تار تار تھی۔ عجب جنگ تھی یہ بھی' جس میں تاریکی فتح یاب ہوتی نظر آ رہی تھی اور طرح طرح کے مکروہ جانوروں پر مشتمل اندھیرے کے اس لشکر میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

اب تک وہ خود ایک کونے میں دبکا خاموش تماشائی تھا مگر اچانک گویا وہ اسپاٹ لائٹ میں نہا گیا اور اب وہ تمام لشکر کا ہدف تھا۔ سب جانور اسے دیکھ کر قصائی کی چھری تیز کرنے کی مانند اپنے اپنے ناخن تیز کر رہے تھے' ان کی گندی آنکھوں میں زرد شعلے ناچتے نظر آ رہے تھے خون میں لتھڑی سرخ زبانیں باہر لٹک رہی تھیں۔ وہ خوف سے دم بخود کھڑا کا کھڑا رہ جاتا ہے اور پھر اچانک ایک کتا یوں لپک کر اس کے سامنے آ جاتا ہے گویا وہ اسے دعوت مبارزت دے رہا ہو' کتا اپنی پچھلی دو ٹانگوں پر کھڑا اسے تضحیک آمیز انداز میں دیکھ کر گویا قہقہہ لگا رہا ہو' گو وہ ان قہقہوں کی آواز نہیں سن سکتا مگر اسے یقین ہے کہ وہ اسی پر ہنس رہا ہے۔ کتا انسانوں کی طرح قدم قدم چلتا اس کی طرف بڑھا چلا آ رہا ہے اب وہ اس کے پیلے دانت' سرخ زبان اور نیلا حلق دیکھ رہا ہے اور تب اچانک اسے احساس ہوتا ہے کہ اس کے ہاتھ میں تو بندوق ہے۔ وہ اپنے خوف پر قابو پا کر بڑی پھرتی سے بندوق سیدھی کر کے گولی چلا دیتا ہے اس مرتبہ تو ہنستے ہنستے کتے کا برا حال ہو جاتا ہے۔ بندوق کی نالی ربڑ کی نالی کی

طرح ٹیڑھی ہو چکی ہے۔ وہ دہشت زدہ سا بندوق کی مڑی ہوئی نالی کو دیکھتا ہے' پھر قد آدم کھڑے کتے اور اس کے کھلے جبڑوں سے نکلتے قہقہوں کو سنتا ہے اس کے بعد وہ بندوق پھینک کر خود ہی خاموشی سے آپریشن کی میز پر مریض کی طرح لیٹ جاتا ہے وہ تمام بھی ڈاکٹروں کی مانند اس پر جھکے اسے دیکھ رہے ہیں۔ کتا آگے بڑھ کر اسے چھوتا ہے اور اس کی چیخیں نکل جاتی ہیں' یوں محسوس ہوتا ہے کہ گویا چیخنے کے لئے اس کے پھیپھڑوں میں ناکافی ہوا ہو' اسے دم رکتا ہوا محسوس ہوتا ہے اور پھر اچانک جیسے چیخ کو آواز مل جاتی ہے۔

سردی کے باوجود پسینہ میں شرابور تھا' جسم پر لرزہ طاری تھا' کھلی ہونے پر بھی وحشت سے آنکھیں کچھ نہ دیکھ رہی تھیں' سانس گھٹنے کے احساس سے سینہ میں درد کی کیفیت تھی۔

کمرہ میں بلب روشن ہو چکا تھا اور اس کی بیوی اسے پریشان نظروں سے دیکھتی ہوئی آوازیں دے رہی تھی۔

''کیا ہوا؟''

وہ خاموش اسے گھورے جا رہا تھا ابھی تک وہ دہشت سے پھٹی آنکھوں کے فوکس میں نہ آ رہی تھی۔

وہ اسے ہلا رہی تھی۔ ''کیا ہوا آپ کو؟''

اس کا لمس اسے حقیقت کی دنیا میں لایا۔

''میں......میں'' اس نے بولنا چاہا مگر خشک حلق سے آواز نہ نکل رہی تھی۔

''خواب دیکھا کیا؟''

''خواب؟'' وہ جھرجھری لے کر بولا ''میرے خدا! خواب جیسا خواب۔''

وہ اٹھ کر پلنگ پر بیٹھ گیا۔ پسینہ سے تر جسم کو ٹھنڈ کا احساس ہوا تو جسم میں کپکپی کی ہلکی سی لہر دوڑ گئی۔ اس کی بیوی اسے دیکھ رہی تھی۔

''جمیلہ!'' وہ کپکپاتے ہوئے بولا۔

''باس! باس!'' وہ اسے بچے کی طرح چمکار رہی تھی۔

''بڑا خوفناک نائٹ میئر تھا۔'' وہ سرگوشی میں بولا۔

"اس کا ذکر نہ کرو" وہ اس کے ماتھے پر سے پسینہ پونچھتے ہوئے بولی۔ "سونے کی کوشش کرو۔"

"نہیں"

"کیوں؟"

"سونے سے خواب کا سلسلہ دوبارہ نہ شروع ہو جائے"

"ایسا ہونا ضروری تو نہیں"

"لیکن ہو بھی تو سکتا ہے۔" وہ کپکپاتے ہوئے بولا۔ "میں اس خواب کی دہشت برداشت نہیں کر سکتا۔"

وہ اسے خاموشی سے تھپکتی رہی اور اس نے رک رک کر اور کانپ کانپ کر نائٹ میئر سنایا۔ اس دوران وہ اس کے منہ اور سینہ پر آہستہ آہستہ سے ہاتھ پھیرتی رہی۔ اب وہ قدرے پرسکون تھا۔

"دراصل مجھے کتوں سے بڑا ڈر لگتا ہے۔"

"ہاں!" وہ جیسے خوابیدہ سی بولی۔

"تمہیں پتہ ہے مجھے بچپن میں کتے نے کاٹ لیا تھا؟"

"اچھا؟" اس کی آواز بوجھل بوجھل سی تھی۔

"ہاں!" وہ.......... بولا "میں دوستوں کے ساتھ کھیل رہا تھا کہ اچانک کتوں کی ایک ٹولی آئی۔"

"پھر؟"

"پھر کیا۔" وہ پرسکون آواز میں بولا۔ "وہ تمام کتے ایک مریل کتے کے پیچھے پڑے تھے۔"

وہ خاموش تھی مگر اس کا ہاتھ بول رہا تھا۔

"اوہ!" بیوی کا ہاتھ کہیں سے کہیں جا پہنچا تھا اس کے جسم سے سردی کی لہریں جیسے رضائی کی روئی میں جذب ہو چکی تھیں اب وہ خاصا گرم تھا۔ بیوی کا جسم نرم تنور بن چکا تھا۔ اس کی گرم سانسیں اس کے منہ پر تھیں، لحاف میں منہ سر لپیٹے وہ دونوں مل کر گویا ایک تکیہ

بن چکے تھے۔ اس کے ذہن سے اب کتے، بندوق کی مڑی ہوئی نالی، غلیظ جانور اور زرد زرد بدبودار دانت سب نکلتا جا رہا تھا۔ بیوی کا ہاتھ اب بھی جسم پر پھر رہا تھا اور تنے ہوئے اعصاب سکون پذیر ہو چکے تھے۔

"اوہ!" وہ سسکی کے انداز میں بولا۔

"میری جان" وہ جیسے سوئی سوئی سی بولی "میری ڈرپوک جان۔"

"ماں!"

"کیا ہے"

"بھوک لگی ہے۔"

"بھوک!" وہ چیخ کر بولی۔ "ارے مردار! ابھی تو روٹی ٹھور کر بیٹھا ہے اور ابھی گھنٹہ بعد پھر بھوک بھوک شروع کر دی ہے۔"

"تو میں کیا کروں......" وہ ٹھنک کر بولا "بھوک جو لگتی ہے"

"بھوک! بھوک! بھوک!! جان نکال گئی تیری بھوک"

"کچھ دو نہ کھانے کو"

"میں کہاں سے لاؤں کھانے کے لئے"

"پھر پیسے دے دو۔"

"حرام خور! یہ ساری بھوک پیسوں کی ہے"

"لاؤ پھر" وہ ہاتھ پھیلاتا ہوا بولا۔

اور اس نے پیسے لینے کو ہاتھ بڑھایا، ماں پیٹ پر سے قمیض اٹھا کر ازار بند کے ساتھ بندھی ریزگاری کھولنے لگی تو بیٹے نے شرم سے آنکھیں جھکا لیں۔ اس کی ماں کتنی بے شرم ہے اس کے ذہن کے کسی گوشے سے آواز آئی نہیں بے شرم تو نہیں البتہ لاپرواہ ضرور ہے۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

"اے پکڑ پیسے۔" وہ اسے ڈانٹ رہی تھی۔

اس نے ماں سے آنکھیں چار کئے بغیر پیسے لئے۔ نہ جانے یہ پیسے اسے گرم گرم کیوں لگے؟ ڈھیلے قدم چلتا وہ گلی میں گیا مگر اب جیسے اچانک اس کی بھوک ختم ہو چکی تھی،

پیسے مٹھی میں دبائے گھر کے باہر تھڑے پر بیٹھا رہا۔

وہ مسلسل روئے جا رہا تھا۔

"کیا ہوا میرے لعل کو"

مگر وہ منہ سے کچھ بولے بغیر روئے جا رہا تھا۔

"کچھ بولو بھی تو" وہ اسے چمکار رہی تھی۔

مگر وہ اب بھی نہ بولا۔ رونے سے گال بھیگ چکے تھے اور منہ سے نپل نکل کر نیچے گر چکا تھا۔

وہ ایک دو لمحہ اسے خاموشی سے دیکھتی رہی وہ مسلسل رو رہا تھا اس نے نپل اٹھا کر اسے قمیض کے دامن سے پونچھا اور پھر اس کے منہ میں دے دیا مگر اس نے نپل نکال کر پھینک دیا۔ "بھئی بولو بھی تو"

ماں نے اسے ساتھ لگا لیا اور ساتھ لگتے ہی وہ فوراً خاموش ہو گیا۔

جب سے اس کا دودھ چھڑایا گیا تھا تب سے اس پر اسی طرح وقتاً فوقتاً چیخ چیخ کر رونے کے دورے پڑتے تھے۔ وہ نپل منہ سے نکال پھینکتا اور اس وقت تک حلق پھاڑ پھاڑ کر روتا رہتا جب تک وہ اسے ساتھ لگا کر پیار نہ کرتی لیکن ساتھ لگانے کی یہ مصیبت تھی کہ چھاتیوں میں دودھ اتر آتا اور یہی اس مرتبہ بھی ہوا اچانک ہی اسے قمیض کے بھیگنے کا احساس ہوا۔ اس نے ایک نظر اپنے اس اکلوتے بیٹے کو دیکھا جو اس کی گود میں نڈھال سا پڑا تھا اور جسے دودھ کی خوشبو سانپ کی طرح کھینچ رہی تھی اور پھر دودھ کی لہر کی مانند رحم ابل پڑا اس نے بیٹے کا سر دونوں ہاتھوں میں تھاما اس کا منہ چوما۔

وہ آسودہ ہو کر سو رہا تھا۔ ہونٹ نیم وا تھے اور ماتھے پر پسینہ کی لکیر چمک رہی تھی اس نے آہستگی سے اس کے سر کے نیچے سے اپنا بازو نکالا مگر وہ اب نیند کے گہرے پانیوں میں تھا۔

اس نے آنکھیں کھول دیں تو پھیلی دھوپ نے مسکرا کر اس کا استقبال کیا۔ مگر اس کے اعصاب میں اس مسکراہٹ کا ساتھ دینے کی سکت نہ تھی وہ خاموش ساکت اور چت لیٹا رہا۔ پاؤں کی دونوں ایڑیاں جوڑے اور سینے پر ہاتھ باندھے۔ گویا کفن میں لپٹا پڑا ہوا اور

اسے محسوس بھی یہی ہوتا گویا چارپائی لحد میں تبدیل ہو گئی ہے اور وہ اب کفن میں لپٹا پڑا ہے اس احساس کے ساتھ ہی رگ و پے میں جیسے مٹی کی خنکی سرایت کر جاتی اور کافور کی تیز بو سے نتھنے پھڑکنے لگتے۔

یہ عجیب سی بات تھی اور وہ اس کا کسی سے تذکرہ کرنے کی ہمت بھی نہ پاتا تھا مگر یہ حقیقت تھی کہ وہ موت سے بے حد خوفزدہ تھا اور شاید اسی لئے موت کا تصور اس پر پیر تسمہ پا کی طرح سوار رہتا' گویا زندگی کی کڑی دھوپ میں وہ موت کی چھتری تلے راستہ طے کر رہا ہو مگر یہ چھتری عافیت کا احساس دینے کے برعکس موت کے بادل میں تبدیل ہو چکی تھی اور پھر کبھی کبھی یوں ہوتا کہ یہ بادل عجیب و غریب روپ دھار لیتا۔ انجانے چہروں میں تبدیل ہو جاتا مکروہ صورت جانوروں کا لشکر بن جاتا اور یوں اس کے نائٹ میئر چیخوں کو جنم دیتے۔

اپنے وجود کی بے معنویت کا احساس کچوکے دیتا رہتا صبح آنکھ کھلتے ہی اس کے ذہن کے بند کلاک کی کوکو جیسے چہک کر بولتی "ٹن ٹن ٹن! ایک اور بے مصرف دن شروع ہو گیا۔"

"ٹن ٹن ٹن! بے کار شخص کا بے کار وجود!"

وہ سر جھٹک کر دماغ کے اس کلاک کو بند کر دیتا اور کوکو کو اندر کے خانے میں دھکیل دیتا مگر وہ سویوں کی گردش روکنے پر قادر تو نہ تھا۔ چنانچہ تھوڑی دیر کے بعد سوئی جیسے کسی مقام پر اٹک جاتی اور فوراً کوکو باہر آ جاتی۔

"ٹن ٹن ٹن! بے معنی انسان"

بعض اوقات یوں بھی ہوتا کہ کوکو آ کر کچھ بھی نہ کہتی بس شرارت سے خالی گھنٹے بجاتی جاتی۔ ٹن ٹن ٹن ٹن ٹن۔ یہ مسلسل ٹن ٹن سر میں شدید درد پیدا کرتی۔ ماتھا ٹین کے ٹکڑے کی طرح محسوس ہوتا اور کھوپڑی کے پیچھے جیسے ریل گاڑی پٹڑیاں تبدیل کرتی جاتی۔

وہ سر درد کا مریض بن چکا تھا ایسا مریض کہ اسپرین یوں کھا جائے جیسے بچے کھٹی میٹھی گولیاں۔

وہ بستر میں اسی مردہ انداز میں پڑا تھا۔ بند آنکھوں کے پپوٹے بوجھل تھے گویا ان

پر دو سکے رکھ دیئے گئے ہوں' اس نے آنکھیں کھولنے کی کوشش بھی نہ کی۔ کانوں میں بیدار گھر کی آوازیں آ رہی تھیں' ریڈیو پر گانوں کے ساتھ بے معنی چٹکلے سنائے جا رہے تھے۔ ایسے چٹکلے جو بدمزہ گانوں کو مزید بدمزہ بنا دیتے تھے۔ اناؤنسر کی آواز بھی عجب بے تکی سی تھی یا شاید وہ اپنی دانست میں لطیفہ کو ڈراماٹائز کر رہی تھی۔

اس کے لئے یہ لمحے بڑے قیمتی تھے کہ یہ اس کے اپنے تھے۔ اس کی اپنی ذات کے لئے تھے' آج چھٹی تھی' اس نے کہیں نہ جانا تھا اور اسی احساس سے وہ خود کو بہت پرسکون محسوس کر رہا تھا۔ اس نے جسم کو اور بھی ڈھیلا چھوڑ دیا جیسے تیراک لہروں میں آسودہ ہو۔

آواز دیئے بغیر بھی وہ سمجھ گیا کہ اس کی بیوی کمرے میں ہے اسے یہ بھی اندازہ تھا کہ وہ اس پر جھکی اسے دیکھ رہی ہے۔ یہ اس کی پرانی عادت تھی وہ بلی کی طرح دبے پاؤں آتی اور جھکی اسے دیکھتی رہتی اور پھر ایک دم زور سے ہاؤ کرتی وہ جاگ رہا ہوتا تو ہنس کر آنکھیں کھول دیتا سو رہا ہوتا تو ڈر کر بیدار ہو جاتا۔ شادی کے پہلے دن سے یہ ان کا بیدار کرنے کا کھیل تھا اس نے کئی مرتبہ سوچا کہ کسی دن وہ بھی اس سے پہلے اٹھ کر اسی طرح ہاؤ کر کے اسے جگائے لیکن وہ کبھی بھی صبح کا پرندہ نہ بن سکا ہمیشہ وہی اسے جگاتی دو چار مرتبہ اگر اتفاق سے اذان کی آواز سے جاگا بھی تو ہاؤ کرنے کے بجائے دوسرے ہی دھندے میں لگ جاتا۔

جمیلہ کو صبح سویرے جاگ کر نہانے کا بہت شوق تھا اسے اس روز روز کے نہانے سے بہت چڑ تھی۔

''بھئی! یہ کیا صبح سویرے اٹھ کر ٹین کنستر کھڑکا کھڑکا کر دنیا پر جعلی عکس ڈالتی ہو۔''

''کیا جعلی عکس؟''

''یہی کہ ہم......''

''کیا بے ہودگی ہے۔'' وہ جھلا کر کہتی ہے۔

''میں بھی تو یہی کہتا ہوں۔''

''کیا؟''

''جب کوئی شرعی جواز نہیں تو یونہی بلاوجہ نہانے سے گناہ ہوتا ہے۔''

''اب میں تمہاری طرح بھی نہیں کہ کچھ ہی ہو جائے نہ نہانے کی قسم کھا رکھی ہے۔''

''کیا کچھ ہو جائے......؟''

جب جمیلہ نے ہاؤ نہ کیا تو اس نے خود ہی آنکھیں کھول دیں ''ہائیں! جمیلہ کہاں گئی''

جمیلہ بے سدھ سو رہی تھی۔

تو کیا میں خواب دیکھ رہا تھا۔ شکر ہے کہ یہ خواب بے ضرر سا تھا!

اس وقت سے جو بلب جلایا تھا تو اسے بند کرنے کا کسی کو ہوش نہ رہا تھا سو وہ اب تک جل رہا تھا۔ جمیلہ کروٹ لئے سو رہی تھی۔ وہ اسے خاموشی سے دیکھتا رہا۔ بالوں کی لٹوں کے فریم میں چہرہ کا نمک نکھر رہا تھا۔ کان کی ایک لو میں ٹاپس کے رنگ چمک رہے تھے۔ رضائی سے باہر نکلے بازو پر بالوں کی سرمئی تحریر تھی اس کے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں کی پوریں' بچوں کی طرح پولی پولی تھیں۔ انگلیوں کے اختتام پر گڑھے پڑتے تھے جب وہ زیادہ لاڈ میں آتا تو ہاتھ پکڑ کر انگلیوں کے ان گڑھوں پر بیرمنگل گنا کرتا۔ جمیلہ کا چہرہ گول تھا اور اس پر چھوٹی سی ناک تھی۔ اس چھوٹی سی ناک کی وجہ سے وہ عورت کم اور بچی زیادہ لگتی۔ لیکن ناک سے اوپر بھاری پپوٹوں والی بادامی آنکھوں نے چہرہ کو جاپانی رنگ دے دیا تھا۔ یہ آنکھیں عجیب پراسرار تھیں وہ آج تک ان کے صحیح رنگ کا اندازہ نہ کر پایا تھا۔ یوں دیکھنے کو تو یہ آنکھیں بھوری تھیں مگر اس کے موڈ کے ساتھ ساتھ ان کی رنگت تبدیل ہوتی جاتی' سوچ میں ڈوبی ہوتیں تو جیسے بادل جھیل کی سطح پر چھا جاتے' مسکراتی تو آنکھوں میں سنہری لہریئے دوڑ جاتے' غصہ میں آتی تو سرخ ڈورے کھنچ جاتے' ہنستی تو سورج کی کرنیں لہروں سے اٹکھیلیاں کرتیں' اسے ہر موڈ میں جمیلہ کی آنکھیں دیکھنے اور ان کے صحیح رنگ کا اندازہ لگانے کی عادت ہو چکی تھی البتہ وہ اس وقت ان آنکھوں کی رنگت بھی نہ دیکھ پاتا تھا کہ اس وقت وہ کبھی آنکھیں نہ کھولتی۔

''ذرا آنکھیں تو کھولو''

"بھئی یہ کیا بے شرمی کی بات ہے۔"

"ہنھ......" وہ بند آنکھوں پر ہاتھ بھی رکھ دیتی۔

"پلیز"

"پلیز"

"خدا کی قسم"

"............"

"میری خاطر!"

وہ گھگھیاتا رہتا مگر اس نے کبھی آنکھوں کا رنگ نہ دکھایا آخر کار اس نے کہنا چھوڑ دیا تاہم دل میں ایک کمی کے احساس کی کھٹک سی رہتی۔

وہ کروٹ کے بل لیٹا اسے دیکھتا رہا اور پھر دل میں شدید خواہش پیدا ہوئی کہ کسی طرح ان خوابیدہ آنکھوں کا رنگ تو دیکھے' جس طرح ڈاکٹر پپوٹے الٹ کر آنکھ دیکھتے ہیں اسی طرح میں بھی اس کی آنکھ دیکھ ڈالوں' کیا پتہ نیند میں یہ بھوری آنکھیں کالی ہی ہو جاتی ہوں' کمال ہے اس نے سوچا یہ میری بیوی ہے میں اس کے جسم کے نشیب و فراز سے آگاہ ہوں۔ مجھے یہ بھی علم ہے کہ جسم پر کتنے تل ہیں اور یہ بھی کہ وہ کہاں کہاں ہیں۔

مگر مجھے ابھی تک یہی نہیں علم کہ اس کی آنکھوں کا صحیح رنگ کیسا ہے حد ہو گئی! پھر دل میں ایک نیا خیال پیدا ہوا کہ کہیں یہ ناگن تو نہیں۔ سو سال بعد تو ناگ اور ناگن اپنی جون بدل کر مرد اور عورت بن جاتے ہیں۔ سنا ہے ناگن عورت بن جائے تو اپنے پیار سے مرد کو مست کر دیتی ہے۔ جیسے ناگن کے جنم میں وہ بین پر جھومتی تھی اسی طرح عورت کے جسم میں آ کر بھی وہ مست ہو کر پیار سے شوکتی ہے۔ ایسی عورتیں اپنے مرد کو وہ عجیب و غریب پیار دیتی ہیں کہ وہ اسی کا غلام بن کر رہ جاتا ہے مگر یہ ناگن عورت بن کر بھی اپنی فطرت تبدیل نہیں کرتی اور لچکیلے جسم میں کہیں نہ کہیں زہر کی تھیلیاں چھپا کر رکھتی ہے۔ ایسی عورت جب انتقام لینے پر آتی ہے تو ناگن بن کر ہی انتقام لیتی ہے۔ پہلے اپنا پیار چھیننے والی عورت کو ڈستی ہے پھر اپنے مرد کو اپنے پیار سے محروم کر کے سزا دیتی ہے لیکن اس سزا میں وہ خود بھی شریک ہوتی ہے اس لئے ایک دن خود بھی زخمی ناگن کی طرح دم دے دیتی ہے۔ ضرور یہ جمیلہ بھی

پہلے جنم میں ناگن ہی ہو گی اس نے جھرجھری لے کر سوچا جبھی تو ہر وقت اس کے جسم سے مست کرنے والی عجیب و غریب مہک خارج ہوتی ہے گویا نافہ کھل گیا ہو۔

لاحول ولا میں بھی کیا بکواس سوچ رہا ہوں اگر جمیلہ ناگن ہوتی تو اس کی آنکھیں گول ہوتیں اور وہ پلکیں بھی نہ جھپکا سکتی تھی جب کہ جمیلہ کی بادامی آنکھیں تو آدھے چہرے پر تھیں۔ یہی نہیں بلکہ اس نے ہزاروں مرتبہ اسے پلکیں جھپکاتے بھی دیکھا تھا۔ میں بھی کیسا گدھا ہوں صبح سویرے نہ اللہ کا نام' نہ رسول کا نام اور شروع کر دیا اپنے پرورٹیڈ ذہن کا کھیل!

(2)

"کلمۂ شہادت"

مجمع میں سے کسی نے مردہ آواز میں ہانک لگائی جس کے جواب میں کوڑے کے ڈھیر پر مکھیوں کی بھنبھناہٹ ایسی تھکی تھکی نڈھال آوازوں کی ایک لہر دوڑ گئی "اشہدان الہ الا اللہ......" کلمہ کا پہلا حصہ بڑے جوش و خروش سے ادا کیا گیا لیکن پھر بتدریج آوازوں پر تھکن غالب آتی گئی۔ حتیٰ کہ آخری حصہ بڑبڑاہٹ کی مانند منہ میں دب کر رہ گیا اور لوگ پھر اپنی دنیاداری کی باتوں میں مشغول ہو گئے۔ وہ کوئی لمبا چوڑا جلوس نما جنازہ نہ تھا' جمیل نہ کوئی مذہبی شخصیت تھا اور نہ ہی مشہور سیاسی لیڈر۔ حتیٰ کہ وہ تو طالب علم رہنما بھی نہ تھا۔ وہ تو چھ ماہ کا ننھا منا تھا جو اس وقت لٹھے میں لپٹا باپ کے بازوؤں پر دھرا تھا۔

گرمی ایسی زیادہ نہ تھی لیکن فضا میں گھٹن اور حبس تھا اور چپچپاتے جسموں پر کپڑے ایک بوجھ تھے۔ آسمان پر کہیں کہیں بادلوں کے سفید ٹکڑے چھ ماہ کے ننھے بچوں کے کفن ہی معلوم ہوتے تھے۔

وہ ہمیشہ سے ہی آہستہ آہستہ چلنے کا عادی تھا لیکن اس وقت تو جیسے اس کے قدم اٹھ ہی نہ رہے تھے' جمیل کا بوجھ کچھ ایسا زیادہ نہ تھا۔ وہ شروع سے ہی بیمار تھا وہ بیٹا جوان کی محبت بھری زندگی کا مظہر تھا وہ بیٹا جو کشتِ الفت کا اولین پھول تھا اور وہ بیٹا جو ازدواجی زندگی میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا تھا وہ اس دنیا میں چھ ماہ تک مریضانہ سانس لینے کے بعد آج اپنے باپ کے بازوؤں پر اپنا آخری سفر طے کر رہا تھا۔ چھ ماہ کی مریضانہ حیات

نے اس کمزور بچے کو اور بھی کمزور کر دیا تھا اور آخری ایام میں تو کمزوری کی یہ حالت تھی کہ تین فٹ کے فاصلے سے اس کے رونے کی آواز بھی نہ سنائی دیتی تھی۔ وہ بالکل ہڈیوں کا ڈھانچہ بن چکا تھا مگر باپ کے لئے بیٹے کا پھول ایسا بوجھ بھی ناقابل برداشت محسوس ہو رہا تھا۔ قدم اٹھ نہ رہے تھے اور بعض اوقات اس کے ہاتھوں میں اچانک ہی لرزش کی لہر دوڑ جاتی اور ٹانگیں جیسے لڑکھڑا جاتیں۔ اس کے دوست نے اسے بازو کا سہارا دے کر سنبھالا۔

"لاؤ مجھے دے دو"

"نہیں۔" اس نے گھٹے گھٹے لہجے میں جواب دیا۔

جنازہ کے ساتھ کوئی زیادہ لوگ نہ تھے بس چند دوست اور چند پڑوسی اور حبس میں وہ سب ماتھے کا پسینہ پونچھتے چیونٹیوں کی چال چلتے جا رہے تھے۔ جب وہ ادھر ادھر کی باتوں سے اکتا جاتے تو پھر موت کے موضوع پر آ جاتے۔

"بے چارہ بڑا غم زدہ ہے۔"

"ہاں بھئی کیوں نہ ہو ایک ہی بیٹا اور وہ بھی چل بسا۔"

"ہا!" ایک نے ٹھنڈی سانس لی۔

مگر اس کا دھیان کسی کی طرف بھی نہ تھا حتیٰ کہ اپنے ہاتھوں پر دھری لاش کا احساس بھی بعض اوقات شعور سے پرواز کر جاتا۔ بس اسے یہ احساس تھا کہ وہ چل رہا ہے اور اس کے پیچھے پیچھے محلے کے لوگ اور دوست چلے آ رہے تھے۔ اتنے میں اس کے دوست نے بڑھ کر کفن میں لپٹا بچہ اس سے لے لیا' اس مرتبہ اس نے انکار نہ کیا وہ اپنے دوست کے ساتھ قدم ملائے چل رہا تھا۔ مگر اب خالی ہاتھ اسے اپنے جسم کا حصہ نہ معلوم ہو رہے تھے یوں لگتا جیسے کسی اور انسان کے بے جان ہاتھ اس کے ساتھ جوڑ دیئے گئے ہوں اس کا ایک بازو سو گیا تھا اور اب اس میں عجیب قسم کی سرسراہٹ ہو رہی تھی۔ بے خیالی میں چہرہ پر ہاتھ پھیرا تو احساس ہوا کہ شیو بڑھی ہوئی ہے اس کے ایک دو دوست اس کے ساتھ چلتے ہوئے اپنے اپنے انداز میں تسلیاں دے رہے تھے اس نے ویران ویران آنکھوں سے انہیں دیکھا اور خاموش رہا۔ اس کے ایک دوست نے سگریٹ سلگا کر اسے دینا چاہا مگر اس نے انکار کر دیا۔ سڑک پر کسی انگریزی فلم کے اشتہار پر اس کے نگاہ پڑی تو ایک لمحہ کو اس کی نظریں جیسے

اشتہار والی حسینہ کی نیم عریاں چھاتیوں کے درمیان اٹک کر رہ گئیں لیکن صرف ایک سیکنڈ کو' اس کے بعد جیسے اس کے ذہن میں کسی بچھو نے ڈنگ مارا اور اس نے پھر لاش کو اپنے بازوؤں پر دھر لیا۔ سامنے چوک پر ٹریفک کے سپاہی نے انہیں دیکھا اور جلدی سے اشارہ بدل دیا۔ انہیں چوک سے گزرتے دیکھ کر اکثر موٹریں اور تانگے رک گئے۔ بعض سائیکل والے جنازہ کے احترام میں سائیکلوں سے اتر گئے اور یہ سب سے بے نیاز آہستہ آہستہ مگر یکساں رفتار سے ہاتھوں پر بچہ کی لاش لئے یوں گزر رہے تھے جیسے قدیم دور کا کوئی پروہت دیوتا کی بھینٹ لئے بڑے ادب اور احترام سے معبد کی طرف رواں ہو اور ایسے میں کوئی چلایا۔

"کلمۂ شہادت!"

اس کلمہ شہادت کی گونج ایک اور کلمہ شہادت پر ختم ہوئی۔ اس کی ماں کا انتقال بچپن ہی میں ہو گیا تھا وہ اس وقت تین چار برس کا تھا۔ پتلا دبلا سا جس کی ناک ہر وقت بہتی اور جس کے ہاتھ میں گڑ کی ڈلی رہتی۔ اس سے پہلے اسے نپل کی عادت تھی۔ دن رات نپل منہ میں رہتا تھا۔ سوتے وقت بھی اگر نپل منہ سے نکل جاتا تو فوراً بیدار ہو کر چیخ چیخ کر رونا شروع کر دیتا۔ اس کی ماں نیند کی ماتی آنکھوں سے کبھی اسے تھپک کر سلاتی' کبھی گالیاں نکالتی اور کبھی پیٹتی۔ بعض اوقات اس کے دل میں اس کے لئے بے پناہ پیار اُمڈ آتا اور وہ اس کے منہ میں سوکھی چھاتی پھر دے دیتی۔ جب خدا خدا کر کے نپل چھٹا تو اس کی جگہ گڑ کی ڈلی نے لے لی۔ دن بھر گڑ کھاتا اور رات کو چیخ چیخ کر روتا۔

ماں مری تو وہ بھی سب کے ساتھ ماں کے سرہانے بیٹھ کر خوب ہی رویا تھا۔ یہ جانے بغیر کہ ماں کا مرنا کیا ہوتا ہے اور یہ کہ اب اس کی ماں اس کے رونے پر اٹھ کر اسے پیٹتی کیوں نہیں' پیٹتی نہیں تو کم از کم دو چار گالیاں ہی نکالے کیونکہ اس کے بعد ہی وہ پیار کرتی تھی۔ اس کی ماں کی چارپائی کے گرد روتی ہوئی عورتوں نے بھیڑ لگا رکھی تھی' اس کی بڑی بہنیں بھی رو رہی تھیں اس کا باپ بھی رو رہا تھا اور گڑ کی ڈلی ہاتھ میں لئے وہ بھی رو رہا تھا۔ آنکھیں اور ناک ایک ہی رفتار سے بہہ رہی تھیں اور مکھیوں نے اسے اپنے نرغہ میں لے رکھا تھا۔

وہ سب سے چھوٹا تھا اور اس کی ماں اسے باقی بچوں کے مقابلہ میں زیادہ چاہتی تھی بلکہ رات کو اسے اپنے ساتھ سلاتی تھی۔ سردی ہو یا گرمی وہ ہمیشہ اس کے ساتھ لپٹ کر سوتا تھا۔ ماں کے جسم کی نرم نرم گرماہٹ اس کے لئے گویا نیند کی گولیوں کا کام کرتی تھی اور اسی لئے ماں کی موت کے بعد وہ رات کو خوب رویا اسے نیند نہ آتی تھی۔ گھر بھر پر سوگ کی کیفیت مسلط تھی۔ بات بات پر اس کے باپ اور بہنوں کے آنسو نکل آتے تھے اسی لئے کسی نے اس کے رونے کی طرف توجہ نہ دی چنانچہ وہ ہر رات اسی طرح روتے روتے سو جاتا‘ ایک رات اس نے خواب میں ماں کی کفن میں لپٹی لاش دیکھی تو ڈر کر اٹھ بیٹھا‘ اندھیرے کمرے میں وہ بستر پر بیٹھا بلک بلک کر رو رہا تھا‘ ’’ماں! میری ماں‘‘ اس کے حلق سے گھٹی گھٹی آوازیں نکل رہی تھیں‘ ’’ہائے ماں!‘‘

اس کی بڑی بہن کی آنکھ کھل گئی۔

’’کیا ہے؟‘‘ اس نے چمکار کو پوچھا

جواب میں وہ اس کی چارپائی پر چلا گیا اور بغیر کچھ کہے اس کے ساتھ لپٹ کر سو گیا۔ بہن کی آنکھیں بھیگ گئیں اور دل میں ننھے بھائی کے لئے پیار کا چشمہ ابل پڑا۔ اس کے بعد وہ بہن کے ساتھ سوتا رہا اور پھر نہ کبھی اس نے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا اور نہ ہی راتوں کو اٹھ کر رویا۔ لیکن کچھ ہی عرصہ بعد وہ یوں بدلی کہ کچھ سے کچھ ہوگئی اور اس نے یہ کہہ کر اسے ساتھ سلانا بند کر دیا۔

’’تم اکیلے لیٹو۔ ساتھ سوتے ہو تو گدگدی ہوتی ہے۔‘‘

یوں وہ اکیلا سونے لگا۔ اب اسے اکیلے نیند بھی آجاتی تھی اور ماں کی موت بھولا بسرا سپنا تھی۔

اس میں بعض نئی قسم کی جسمانی تبدیلیاں پیدا ہو رہی تھیں جن سے ذہن میں عجیب سے خیالات کے تانے بانے کی کھڈی چلتی رہتی۔ وہ کوشش کرتا کہ جھاڑ پونچھ کر مکڑی کے جالوں کی طرح ذہن کو ایسے غیر ضروری خیالات سے پاک وصاف رکھے مگر وہ ناکام رہتا۔ رات کو وہ خواب میں خود کو پہاڑوں کی چوٹیاں سر کرتے پاتا اور عین جب وہ چوٹی کو چھونے کے قریب ہوتا تو پاؤں کے نیچے کی چٹان سرک جاتی اور وہ نیچے گرتا ہوا بیدار ہو

جاتا۔ بعض اوقات دوکان پر وہ سیب یا انار خریدنے جاتا تو دکاندار کی ترازو میں سے یہ پھل اڑ کر ہوا ہو جاتے اور پتنگ لوٹنے والے لڑکوں کی مانند ان کے پیچھے پیچھے دیوانہ وار پھرتا۔

وہ شروع ہی سے خاموش طبع تھا مگر اب تو وہ ہر وقت گم رہتا۔ سر جھکائے اسکول جاتا راستہ میں کبھی نظریں نہ اٹھاتا خالاؤں‘ پھوپھیوں اور دیگر عورتوں سے ہمیشہ آنکھ نیچی کر کے بات کرتا۔ کبھی کسی غیر لڑکی کو نظر بھر کر نہ دیکھا کہ عورتوں اور لڑکیوں کو دیکھ کر اس پر انجانا خوف مسلط ہو جاتا‘ تمام محلہ اور برادری میں اس کی شرافت کی دھوم تھی۔

’’واہ بہن! بیٹا ہو تو اس جیسا ہو۔‘‘

’’کبھی آنکھ اٹھا کر بات نہیں کرتا۔‘‘

’’جبھی تو شکل پر ایسا بھول پن ہے۔‘‘

’’بالکل معصوم ہے۔‘‘

’’لڑکیوں جیسا سیدھا سادا۔‘‘

’’نہ بہن آج کل کی لڑکیاں بھی اس جیسی سیدھی نہ ہوں گی۔‘‘

’’ہاں! کم از کم تمہاری......‘‘

’’دیکھو بہن پہلے اپنی چارپائی کے نیچے جھاڑو پھیرو‘ پھر مجھے کہنا۔‘‘

الغرض جھکی آنکھیں اس کا ٹریڈ مارک بن چکی تھی وہ شریف تھا یا نہیں اسے تو اس کے کندھوں کے فرشتے ہی جانیں لیکن جھکی نظروں کی سیدھی وجہ یہ تھی کہ وہ عورت کا سینہ نہ دیکھ سکتا تھا۔

چھاتیوں کا ابھار دیکھتے ہی خیالات کی گاڑی تیزی سے پٹڑیاں بدلتے ہوئے اس پٹڑی پر جا نکلتی جس کے اختتام پر سرخ حروف میں مردے کی کھوپڑی اور ہڈیوں کے ساتھ ڈینجر لکھا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ دیگر ہم عمر لڑکوں کے برعکس ادھر ادھر کی کزنوں کے چکر میں کبھی نہ پڑا اور اسی لئے ہر عورت اسے ماں بہن معلوم ہوتی تھی۔ صحیح معنوں میں!

کالج میں پہنچ کر بھی وہ عام مفہوم میں کالجیٹ نہ بن سکا وہ لباس وغیرہ کے معاملہ میں پہلے کی مانند اب بھی لاپرواہ ہی تھا۔ اسے سیر و تفریح کا بھی شوق نہ تھا۔ ادھر گھر میں بھی کوئی ایسی خاص کشش نہ تھی۔ باپ نے دوسری شادی نہ کی تھی سو وہ قبل از وقت بوڑھا

ہو گیا۔ ایک بیٹی کی شادی ہو چکی تھی اور بقیہ تین کی فکر اسے مزید بوڑھا کر رہی تھی۔ باپ' بھائی اور بہنیں سب کیا کیا سوچتے تھے یہ کسی کو نہ معلوم تھا۔ سب اپنے اپنے مدار پر گردش کرنے والے سیاروں کی مانند تھے۔

گو وہ پڑھائی میں بہت اچھا تھا مگر اس کی اعصابیت اسے ٹک کر نہ بیٹھنے دیتی۔ چنانچہ جاسوسی ناول پڑھتا رہتا یا پھر انگریزی فلمیں دیکھتا جہاں طرح طرح کی بکنیاں اسے انگیٹھی پر دھری کیتلی کے پانی کی طرح کھولا کر رکھ دیتیں۔

یونیورسٹی میں لڑکیوں کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے کے مواقع کی کمی نہ تھی بلکہ باقی دوستوں کی باتوں سے تو یہ معلوم ہوتا کہ بیشتر لڑکیاں نوٹس لینے اور پیار دینے کو تیار رہتی ہیں مگر یہ تو اپنی ہی بین پر رقص کرنے والا سانپ بن چکا تھا!

اور تب اس نے جمیلہ کو دیکھا!

جمیلہ اس کی بہن کی شادی پر آئی تھی اور حسب دستور کسی دور کے رشتے سے بہن ثابت ہوتی تھی۔ سانولا رنگ' گول چہرہ چھوٹی سی ناک اور بھرے بھرے ہونٹ' وہ اس سانولی جاپانن کو دیکھ کر مبہوت ہو گیا۔ اتنا کہ خلاف عادت دونوں آنکھیں کھولے اس کا سراپا دیکھتا رہا اس کی چھاتیاں دیکھ کر جسم میں لطیف کپکپی دوڑ گئی' اس کی چھاتیاں بہت بڑی تھیں اتنی بڑی کہ وہ اس کی اصل عمر کے مقابلہ میں زیادہ معمر معلوم ہوتی تھیں اور اس کے اپنے جسم کا نہیں بلکہ کسی ایسی عورت کے جسم کا حصہ معلوم ہوتی تھیں جو کئی بچوں کو دودھ پلا چکی ہو۔

اس نے اچانک خود کو ایک چھوٹا سا بچہ محسوس کیا۔ وہ بچہ جو اپنی مردہ ماں کے سرہانے بیٹھ کر بلک بلک کر رو رہا تھا۔

وہ لڑکیوں میں دلچسپی نہ لیتا تھا لیکن اس نے جمیلہ کے ساتھ باتیں کرنے کے کئی مواقع پیدا کر لئے۔ جمیلہ بھی اس کے اندرونی اضطراب سے بے خبر اسے بھی ایک بے ضرر سا کزن سمجھ کر اس کے ساتھ ہنس ہنس کر باتیں کرتی رہی۔ جمیلہ کا چہرہ ان چہروں میں سے تھا جو سنجیدگی اور ہنسی میں یکسر تبدیل ہو جاتے ہیں۔ بھرے بھرے ہونٹوں پر جھکی جھکی آنکھوں والی خاموش جمیلہ اس جمیلہ سے قطعی طور پر مختلف نظر آتی ہنسی میں جس کے بند ہونٹ کھل

جاتے اور سفید دانت چمکدار چہرے کے سانولے پن میں عجیب جنسی کشش پیدا کر دیتے۔ سب مہمانوں کے جانے کے بعد بھی اس نے اصرار کر کے ان لوگوں کو کچھ دن کے لئے روک لیا دراصل وہ اسے مزید دیکھنا اور سمجھنا چاہتا تھا۔

جمیلہ کھل کر گفتگو کرنے والی ثابت ہوئی۔ اس کا آنچل سر سے ڈھلکتا اور چھاتیوں پر آن اٹکتا جسے وہ بے خیالی میں یا تو وہیں پڑا رہنے دیتی ورنہ مزید بے خیالی میں بات کا سلسلہ توڑے بغیر اٹھا کر شانوں پر ڈال لیتی۔ اس کی طرف مسکرا کر دیکھتی تو بھوری آنکھوں میں بیک وقت کئی رنگوں کے لہریئے دوڑ جاتے۔ اس نے خود پر بڑا جبر کر کے جب کبھی بھی اس کی آنکھوں میں جھانکا تو وہاں بیک وقت چلمنیں اٹھنے اور گرنے کا نظارہ کیا۔

کہیں یہ عورت نما لڑکی مجھے بے وقوف تو نہیں بنا رہی۔ کبھی کبھی یہ احساس برف کے سوئے کی طرح چبھتا مگر جمیلہ کے انداز میں ایسی کوئی بات نہ تھی۔ آج تک اس نے شادی کے بارے میں نہ سوچا تھا مگر اب تیسری بہن بیاہی جا چکی تھی۔ وہ ملازم ہو چکا تھا اور باپ بھی خاصا کمزور ہو چکا تھا لہٰذا اب بظاہر شادی نہ کرنے کا کوئی بہانہ نہ رہا تھا۔ یہ یقین تھا کہ جمیلہ سے بہتر بیوی اسے نہیں مل سکتی۔

وہ کمرہ میں دلہن بنی بیٹھی تھی اور باہر دوست اسے نرغہ میں لئے بیٹھے تھے' کوئی چھیڑتا' کوئی کان میں خاص اسرار و رموز پھونکتا تو کوئی اپنے زریں تجربات دہراتا' سب یوں چٹخارے لے رہے تھے گویا کمرہ میں دلہن کی جگہ چاٹ کا تھال رکھا ہے۔ کافی رات گئے ان کی بک بک سے نجات ملی تو وہ دلہن کے کمرے میں آ گیا۔ انہیں بے تکلف ہونے میں دیر نہ لگی اور جلد ہی جسمانی بے تکلفی شروع ہو گئی۔ وہ ایسے محسوس کر رہا تھا جیسے اسے لہروں نے اٹھا رکھا ہے۔ وہ عجیب زیر و بم تھا ایک پر آہنگ ہم آہنگی کا پیدا کردہ زیر و بم اور پھر آسودگی کی گھمبیرتا نے اسے اپنے نرم نرم پروں میں لپیٹ لیا۔ وہ اندھیرے میں جمیلہ کے سینے پر سر رکھے لیٹا تھا۔ وہ خاموش تھی۔ وہ بھی خاموش تھا۔ اس کا چہرہ نرم چھاتیوں میں دھنسا تھا اور اسے پہلی مرتبہ یہ یقین ہو گیا کہ اس کی زندگی کا خلا اب پُر ہو چکا ہے وہ خود کو نوزائیدہ کی مانند محسوس کر رہا تھا۔ جمیلہ کے لئے ایک انوکھا پیار اس کے سینہ میں موجزن تھا۔

لیکن آنسو کیوں؟

اسے احساس بھی نہ ہوا اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ اس نے انہیں روکنے کی کوشش تو بہت کی لیکن ضبط کی کوشش کے ساتھ ہی آنسو اور بھی تیزی سے بہنے لگے۔ حتیٰ کہ وہ سسکیاں لے لے کر رونے لگا' سارا جسم شدت گریہ سے کانپ رہا تھا۔

''آپ رو رہے ہیں؟''

جمیلہ نے حیرت سے پوچھا مگر اس نے جواب نہ دیا' جمیلہ نے اس کا سر ہٹانا چاہا مگر اس نے جمیلہ کو جکڑ رکھا تھا۔

وہ حیران اور پریشان بلکہ کسی حد تک خوفزدہ بھی تھی' اس نے اسے بلانا چاہا مگر وہ نہ بولا۔

یہ پچیس سالہ دولہا نہ تھا یہ تو وہ کم سن بچہ تھا جو اپنی ماں کی لاش کے سرہانے بیٹھ کر رویا تھا۔ یہ جانے بغیر کہ وہ کیوں رو رہا ہے' یہ تو وہ بیٹا رو رہا تھا جو خواب میں ماں کو دیکھ کر ڈر گیا تھا۔ یہ جانے بغیر کے ماں سے کیوں ڈرا جاتا ہے؟

روتے روتے اس کی ہچکی بندھ گئی اور اس کے بعد سوکھی سوکھی سسکیاں لیتے لیتے ہی وہ ایک نڈھال بچہ کی طرح وہیں سینے پر سر رکھے ہوئے ہی سو گیا۔ جمیلہ کا سارا جسم اکڑ گیا تھا مگر اس نے تمام رات اس لئے کروٹ نہ بدلی کہ کہیں وہ جاگ نہ جائے۔

وہ کئی دن تک چور سا بنا رہا مگر جمیلہ نے اس موضوع پر کبھی بات نہ کی اور اس کے لئے وہ دل ہی دل میں اس کا احسان مند تھا کیونکہ وہ اسے مطمئن کرنے کو کوئی معقول جواب نہ دے سکتا تھا۔ وہ تو خود کو مطمئن کرنے کے لئے بھی کوئی ڈھنگ کا جواب نہ دے پایا تھا۔

جمیلہ توقعات سے بڑھ کر اچھی بیوی ثابت ہوئی تھی' سارا گھر اس کا شیدا تھا۔ وہ سارے گھر پر حکومت کرتی تھی مگر زبان درازی سے نہیں بلکہ پیار اور محبت اور عزت اور احترام سے! وہ ساری تنخواہ اس کے ہاتھ پر دھر دیتا اور پھر مہینے بھر ساری فکروں سے بے نیاز ہو جاتا۔ جمیلہ پر اس کا انحصار اس حد تک بڑھ چکا تھا کہ وہ کپڑوں سے لے کر بلیڈ تک اس کی تمام چیزیں خرید کر لاتی تھی۔ اسے یہ پتہ نہ ہوتا تھا کہ کون سے کپڑے کہاں رکھے ہیں۔ وہ خود ہی دھیان رکھتی کپڑے میلے ہوتے تو وہ صاف نکال کر رکھ دیتی اپنے بعض احباب کی

مانند نہ تو اس کی بنیان گندی ہوتی اور نہ جرابیں بدبودار!

''ماں بننے والی ہو؟'' وہ حیرت سے بولا۔

''جی'' وہ قدرے جھینپتے ہوئے بولی۔

''مگر مگر یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو؟''

''کیا مطلب؟''

''ارے بھئی! تمہیں کیسے یقین ہے کہ تم...... تم......'' وہ منہ سے الفاظ' ماں بننے والی ہو' نہ نکال سکا اور فقرہ ادھورا چھوڑ کر خاموش ہو گیا۔

''واہ! میں نہ جانوں گی تو اور کون جانے گا۔''

وہ مردہ لہجے میں بولا۔ ''ہاں تم نہ جانو گی تو اور کون جانے گا۔''

وہ اسے خاموش دیکھ کر بولی۔ ''آپ کچھ چپ سے ہو گئے ہیں۔''

''تو کیا بڑھکیں ماروں۔''

''میرا یہ مطلب تو نہیں''

''تو پھر......''

''کیا آپ کو خوشی نہیں ہوئی؟''

''خوشی؟'' اس نے یہ لفظ یوں بولا گویا زبان پر اس کا ذائقہ محسوس کر رہا ہو۔

''ہاں! ہاں خوشی......؟''

''بھئی! کچھ کہہ نہیں سکتا۔''

''کیوں؟''

''دراصل یہ سب کچھ اتنا اچانک ہے کہ۔''

''اچانک......؟'' وہ تنک کر بولی ''کیا مطلب آپ کا؟''

''یہی کہ یہ بہت...... میرا مطلب ہے ابھی ایسی بھی کیا جلدی تھی؟''

''اگر ایسی جلدی میں نہ تھے تو پھر ہر......''

''نہیں! نہیں میرا یہ مطلب نہ تھا۔'' وہ جلدی سے بولا۔

''تو پھر......؟''

وہ اس کی طرف جواب طلب نگاہوں سے دیکھ رہی تھی مگر وہ اسے کچھ جواب نہ دے سکا۔ اس نے کوشش کی کہ چہرے پر مسکراہٹ لا کر باپ بننے کی مسرت کا اظہار کرے مگر اس کوشش میں ہونٹ محض پھیل کر رہ گئے اور شکل مضحکہ خیز بن گئی اور جب کچھ کہنا چاہا تو صرف ہکلا کر رہ گیا۔ وہ جمیلہ کی آنکھوں کی تاب نہ لا سکا اور سر جھکا لیا۔ وہ رونے لگ گئی۔ اس کا دل تڑپ کر رہ گیا۔ اس نے اسے خاموش کرنے کے لئے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو ہاتھ جھٹک دیا گیا۔

”جمیلہ۔“ اس نے آواز میں پوری مٹھاس بھر کر کہا۔

وہ خاموشی سے اٹھ کر اپنی چارپائی پر لیٹ گئی۔ اس نے ساتھ لیٹ کر اسے منانے کی کوشش بھی کی مگر جب دیکھا کہ وہ مسلسل روئے جا رہی ہے اور اب نہ مانے گی تو اٹھ کر خاموشی سے اپنے بستر پر آ کر پڑ رہا۔ تاریک کمرے میں وہ نظر نہ آنے والی چھت کو گھور رہا تھا۔ ذہن خیالات سے بالکل خالی تھا لیکن پھر بھی وہ ذہن پر ایک غیر مرئی سا بوجھ محسوس کر رہا تھا، جمیلہ خاموش تھی مگر وہ جانتا تھا کہ وہ جاگ رہی ہے۔

وہ خاموشی سے اٹھا، یوں کہ چارپائی نہ چرچرائے اور اس کی چارپائی کی جانب ایک قدم بڑھایا بھی مگر پھر وہ جھجک کر کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ وہ دو بستروں کی مملکت کے درمیان نومینز لینڈ میں بے یقینی کے عالم میں کھڑا رہا۔ وہ اپنی مملکت کی حدود سے باہر تو نکل آیا تھا لیکن اب دوسری مملکت کی حد میں قدم رکھتے ڈرتا بھی تھا۔

اس کے حلق سے عجیب و غریب آوازیں نکل رہی تھیں۔ ”......آ......آ......آؤ......“ کھلے ہونٹوں سے رال کی مانند لعاب بہہ رہا تھا اور آنکھوں سے پانی......وہ عجب کراہت کے عالم میں قے کرتی جمیلہ کو دیکھ رہا تھا۔ خالی معدہ کا مٹیالا پانی منہ سے خارج ہو رہا تھا اور حلق سے زور لگانے کی وجہ سے منہ سرخ ہو رہا تھا۔ اس نے حاملہ بیوی کے لئے دل میں کسی طرح کا ترس پیدا کرنے کی کوشش کی مگر وہاں تو اس کی تکلیف پر مسرت کا احساس غالب تھا۔

یہ پہلی قے تھی مگر آخری نہیں اور اس کے بعد تو دن بدن بد سے بدتر ہوتی گئی۔ گالوں پر چھائیاں آ گئیں اور آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ گئے۔ پیٹ پھولنے کے ساتھ معدہ

کی خرابی بھی شروع ہو گئی۔ اس کی پیاری بیوی محض حاملہ بن کر رہ گئی تھی۔ جیسے جیسے دن گزرتے جاتے جمیلہ کی حالت خراب سے خراب تر ہوتی گئی۔ ان دنوں اسے ایک ہی کام رہ گیا تھا۔ بی کمپلیکس کا سیرپ، پروجیسٹن اور وٹامن کے انجکشن اور وٹامن یا کیلشیم کی ٹکیاں خریدنا......اب وہ اور بھی کمزور ہو چکی تھی۔ سر چکراتا، دل ڈوبتا اور بعض اوقات تو پریشان ہو کر پہروں روتی رہتی۔ کبھی یہاں درد ہے تو کبھی وہاں تکلیف۔ اسے دبانے اور مالش کے لئے ایک دائی کا بھی انتظام کرنا پڑا، جو میٹھا تیل لے کر اسے کمرے میں لے جاتی اور پھر دونوں جیسے گھنٹوں بعد نکلتیں اور اب تو اس کے پاؤں بھی سوج گئے تھے۔ وہ سارا سارا دن مٹی کے ڈھیر کی طرح پڑی رہتی۔ وہ بدوضع پیٹ، پھیلے کولھوں، سوجی پنڈلیوں اور تھل تھل کرتی چھاتیاں دیکھتا تو خود اسے قے کا احساس ہونے لگتا۔ وہ اس کے قریب ہوتی تو اسے اس میں سے عجیب نامانوس بو کا احساس ہوتا۔ ایسی عجیب بو جوان عورتوں میں سے آتی ہے جن پر جن عاشق ہو جاتے ہیں۔

اس کی ایک مخصوص اور مانوس ڈگر پر چلتی زندگی ان دنوں عجب انتشار کا شکار تھی۔ بعض اوقات وہ آنے والے بچے کے بارے میں بڑی تلخی سے سوچتا۔ جس بچے نے پیدائش سے پہلے ہی اس کی زندگی پر شب خون مارا تھا، وہ پیدائش کے بعد کیا گل نہ کھلائے گا۔ دونوں میں عجب طرح کا کھچاؤ پیدا ہو چکا تھا، جس نے بڑھ کر اعصابی تناؤ کی صورت اختیار کر لی تھی۔ جمیلہ نسوانی زندگی کے اس عظیم تجربے میں اپنے شوہر کو بھی شریک دیکھنا چاہتی تھی مگر شوہر ہر ممکن طریقے سے خود کو اس تجربے سے الگ رکھنے کی کوشش میں تھا۔ وہ اس کی وجہ بھی سمجھتی تھی مگر وہ تلخی سے یہ بھی سوچتی کہ میں جب ہر طرح سے سہہ رہی ہوں تو پھر یہ خوش کیوں نہیں؟

”دیکھو!“ وہ خوشی سے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولی۔

”کیا ہے؟“

اس نے پیٹ پر اس کا ہاتھ رکھ دیا اور مسکراتی آنکھوں سے اسے دیکھا۔ پہلے تو اسے کچھ نہ محسوس ہوا پھر تھوڑی دیر بعد ہاتھ تلے حرکت کا احساس ہوا۔

”دیکھا؟“ وہ فاتحانہ انداز میں بولی۔

"ہاں۔" اس نے شکست خوردہ لہجے میں جواب دیا۔

آخری دنوں میں تو وہ بالکل ہی مرجھا کر رہ گئی۔ زرد رنگت اور چہرہ پر چھائیاں، سوکھے بازوؤں اور پلپلی رانوں کے درمیان صرف پیٹ ہی نمایاں ترین تھا۔ اب وہ پر کشش عورت نہ تھی بلکہ ایک مضحکہ خیز چیز بن کر رہ گئی تھی۔ ادھر جب سے اس کا بلڈ پریشر بڑھا تھا اس وقت سے تو گھر میں ہر وقت چخ چخ لگی رہتی۔ وہ اچار کھانا تو چھوڑ چکی تھی لیکن چکنی مٹی چاٹنے کی عادی ہو چکی تھی۔

وہ نو ماہ کی اس بک بک جھک جھک سے تنگ آ چکا تھا۔ وہ سوچتا، پتہ نہیں لوگ کیسے بچوں کی فوج کی فوج پیدا کر لیتے ہیں۔ یہاں تو ایک نے ہی طبیعت صاف کر دی ہے اگر ان بکھیڑوں میں پڑ کر زندگی اجیرن کرنے کا نام باپ بننا ہے تو ہم بے اولاد ہی بھلے۔ جب سے جمیلہ کے دن بڑھے تھے اسے الگ سونا پڑ رہا تھا اور یہ اس کے لئے ناقابل برداشت سزا تھی۔ بعض اوقات وہ تمام رات کروٹوں میں گزار دیتا تھا۔ اس اعصابی بوجھ نے اسے بھی بے حد چڑچڑا بنا دیا تھا۔ سارے فساد کی جڑ اس کا حمل تھا۔ اس لئے بات بے بات اس سے الجھ پڑتا اور پھر جب وہ روتی تو پشیمان ہو کر اس کے آگے پیچھے پھرتا۔ جب وہ دیکھتا کہ وہ چھوٹے چھوٹے کپڑے سی رہی ہے تو اس پر جھنجھلاہٹ کا دورہ پڑ جاتا۔ جواب میں وہ اس پر برس پڑتی، تو پھر ڈر جاتا۔ کبھی کبھی اکڑ بھی پڑتا لیکن نتیجہ ہمیشہ بدمزگی کی صورت میں ظاہر ہوتا۔ غرضیکہ ان دنوں گھر کی فضا سخت پر تناؤ تھی...... اور اب تو جمیلہ سے زیادہ بے چینی سے وہ خود بچہ کی پیدائش کا منتظر تھا تاکہ حمل کی اس بک بک سے چھٹکارا ملے اور زندگی پہلے کی طرح نارمل بن جائے۔ چنانچہ درد کی پہلی لہر شروع ہونے پر وہ ایسا خوش ہوا کہ جیسے جمیلہ کی جگہ خود اس کا اپنا چھٹکارا ہونے کو ہے۔

"یہ؟" اس نے کسی سے نہیں بلکہ خود سے یہ سوال کیا تھا۔ اس کے لئے اتنی تکلیفیں برداشت کی تھیں۔ بچہ کے سر پر سیاہ بالوں کا گچھا سا تھا، آنکھیں بند تھیں اور گول منہ کے ہونٹ نیم وا تھے۔ پیشانی اور گالوں پر سیاہ بالوں کی تحریر تھی وہ اسے حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے لئے ان دونوں نے نو ماہ تک سکھ کا سانس نہ لیا تھا۔ اسے کراہیت کا عجیب و غریب سا احساس ہوا۔ بیٹے کی پیدائش کا سن کر فخر و انبساط کی جو لہر پیدا ہوئی تھی وہ اب بجلی

کی مانند اس کے اعصاب کو جھٹکے دے رہی تھی۔ اگر اس نے میری نسل چلانی ہے تو اس سے بہتر یہ ہے کہ سرے سے نسل ہی نہ چلے۔ اس نے ایک مرتبہ چھوہارا سے بچے کو دیکھا اور پھر جمیلہ کو جس کے چہرے پر نقاہت اور تکان کے باوجود بھی طمانیت کا گہرا احساس تھا۔ اسے مسکراتے دیکھ کر کوئی یہ اندازہ بھی نہ کر سکتا تھا کہ تھوڑی دیر پہلے اس کی چیخوں نے سارا محلہ سر پر اٹھا رکھا تھا۔ جمیلہ کی ماں اور بہنیں بیک وقت بول رہی تھیں۔ سب اسے مبارکباد دے رہے تھے۔ اس کا باپ بھی دادا بننے کی خوشی میں لقہ کبوتر بنا پھر رہا تھا۔

دائی گندگی سے بھری کنالی اٹھا کر باہر جاتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ "باؤ جی! جوڑے تے سو روپیاں توں گھٹ نہ لواں گی۔"

"او جا دفع ہو۔" اس نے دل میں سوچا، اس کی ساس بازار سے لانے والی چیزوں کی فہرست گنوا رہی تھی، چار عرق، اجوائن، سونٹھ، گری بادام، چار مغز، دیسی گھی...... اس نے جب تمام اخراجات کا جائزہ لیا۔ ساتھ ہی اس نے ساس، سالیوں کی رہائش کے اخراجات میں انہیں بوقت رخصت دیئے جانے والے جوڑوں کی قیمتیں جمع کیں تو اس پر بے اولادی کے فوائد آئینہ ہو گئے۔ دوستوں کی دعوت، دائی کے مطالبات اور کھسروں کے تقاضے ان پر مستزاد تھے۔ حتیٰ کہ کان میں اذان دینے والے مولوی نے بھی دس روپے جھاڑ لئے تھے۔ اگر اس نے یہ سوچا تھا کہ بچہ کی پیدائش کے بعد اس کے تمام مسائل ختم ہو جائیں گے، تو یہ اس کی بھول تھی۔ جب تک ساس اور سالیاں گھر پر رہیں وہ خود ہی اسے اٹھائے اٹھائے پھرتیں لیکن جب چھلے کے بعد جوڑے اور نقدیاں سمیٹ کر سب اپنے اپنے گھروں کو سدھاریں تو بچہ پالنے کے آداب کا علم ہوا۔

جمیلہ نے گو اپنے نام پر اس کا نام جمیل رکھا لیکن وہ کوئی ایسا حسین و جمیل نہ تھا۔ گو جمیلہ کے لئے وہ دھرتی پر اترا ہوا چاند تھا۔ جمیل کی صحت پہلے دن ہی سے خراب رہی تھی، اسے کبھی حرارت ہو جاتی، وہ ٹھیک ہوتی تو جلاب لگ جاتے۔ جلاب ٹھیک ہوتے تو کوئی اور بکھیڑا کھڑا ہو جاتا۔ غرضیکہ اس کے مٹھی بھر وجود نے میاں بیوی کے سکھ چین کو اپنی ننھی مٹھی میں بند کر رکھا تھا اور جب وہ اپنی دونوں مٹھیاں بھینچ کر چیخ مار کر روتا تو کرخت آواز سے دماغ کی رگیں چٹخنے لگتیں، جمیلہ رات رات بھر اس کے ساتھ جاگتی اور دن کو سرخ آنکھوں

سے اسے بہلاتی رہتی۔

یار لوگ اسے مبارکبادیں دے رہے تھے۔ اس نے بھی محلے میں لڈو بانٹے تھے اور دوستوں کو ٹی پارٹی دی تھی لیکن دل پر عجب سی بیزاری مسلط تھی اور جیسے جیسے جمیل کی عمر اور اس کے ساتھ اس کی بیماری بڑھتی گئی' اس کی بیزاری میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔

وہ دودھ پلاتی جمیلہ کو دیکھتا' تو محسوس ہوتا گویا یہ اس کی نہیں بلکہ کسی اور کی بیوی ہے' وہ قریب آتی تو اس میں سے اسے جمیل کے پاخانے کی بو آتی۔ اس کے بستر پر غلطی سے بیٹھ جاتا تو وہ کہیں نہ کہیں پیشاب سے گیلا ہوتا۔ جمیلہ کے ساتھ لیٹے اور اسے پیار کئے گویا صدیاں بیت گئی تھیں۔ جمیلہ بھی اب اس کی طرف پہلے کی طرح توجہ نہیں دیتی تھی یوں محسوس ہوتا گویا یہ سب جتن اس نے بیٹا لینے کے لئے کئے تھے اور اب مطلب نکل جانے کے بعد خاوند جیسا کوئی مسئلہ نہ رہا تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ اسے کھانے پینے کی تکلیف نہ تھی اسے کپڑے بھی وقت پر دھلے دھلائے ملتے تھے۔ یہ دوسری بات ہے کہ رسی پر اپنے کپڑوں کے ساتھ جمیل کے پوتڑے دیکھ کر اسے اپنے کپڑوں سے بھی پیشاب کی بو آنے لگتی۔ گھر میں دن کے تمام آرام اسے میسر تھے البتہ رات کی تسکین نہ تھی۔ وہ نرم گرم قرب سے محروم کر دیا گیا تھا۔ لہٰذا وہ اس بچہ کی طرح روٹھا روٹھا اور اینٹھا اینٹھا تھا جو نئے بچے کی پیدائش کے بعد ماں کی عدم توجہی کا شکار ہونے کے باعث دل ہی دل میں کڑھتا رہتا ہے۔

اسے اپنا تمام جسم شعلوں کی آنچ میں پگھلتا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ اٹھا اور ٹھنڈے پانی کے دو گلاس پی کر پھر چارپائی پر آ لیٹا۔ لیکن نہ نیند نیناں نہ انگ چیناں۔

وہ اٹھ کر صحن میں آ گیا۔ نصف شب کا چاند چمک رہا تھا مگر دودھیا چاندنی اسے ملگجی سی لگ رہی تھی۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے اس کے تپتے گالوں کو سرد انگلیاں بن کر سہلا رہے تھے۔ ٹھنڈے پانی نے سینہ میں جو سرد لہر بنائی وہ اعصاب تک نہ پہنچ پائی تھی بلکہ وہیں جم کر رہ گئی تھی۔ کوٹھے پر ٹہلتے ٹہلتے تھک گیا تو سگریٹ سلگا کر دیوار کا سہارا لے کر کھڑا ہو گیا۔

اسے وہ سنہری زمانہ یاد آ رہا تھا۔ جب میاں بیوی کے درمیان بیٹے کی خلیج حائل نہ تھی۔ اسے اپنا بیٹا ایک غاصب مہمان معلوم ہو رہا تھا اور مہمان بھی بن بلایا۔ اس سے قبل

ان کی زندگی ایک ایسی نیا کی مانند تھی جو پیار کی ندی میں ہر دم رواں دواں ہو مگر اب جیسے ندی جمیل کی دلدل میں تبدیل ہو گئی تھی۔

اس مریض بچہ نے اس کی زندگی تلخ کر دی تھی۔ نہ مرتا ہے' نہ چین لیتا ہے' اس نے تلخی سے سوچا...... مگر وہ اس سے آگے اور کچھ نہ سوچ سکا' اس کا ذہن جیسے بحران کا شکار تھا۔ وہ خود کو پاگل اور وحشی محسوس کر رہا تھا۔ یہ میں کیا سوچ رہا ہوں؟ اس نے بے بسی سے سوچا اور پھر پیشانی کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر' جیسے نڈھال سا ہو کر بیٹھ گیا۔ اس کا جسم ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔ سردی نہ تھی لیکن وہ اب سردی محسوس کر رہا تھا وہ ٹھنڈی ہوا جو پہلے خوشگوار محسوس ہو رہی تھی' اب چھری کی طرح کاٹتی ہوئی برفیلی ہوا تھی۔

وہ اٹھا اور اندر کمرے میں آ گیا۔

اس کا بیٹا اس کی بیوی کے بازو پر سر رکھے میٹھی نیند سو رہا تھا۔ مسلسل بیماری نے اس کے چہرے کو پچکا دیا تھا اور اب وہ ایسے لگتا جیسے ہڈیوں کے ڈھانچے پر پتلا سا گوشت منڈھ دیا گیا ہو۔ وہ کھڑا اسے دیکھتا رہا۔

یہ میرا بیٹا ہے اس نے میری نسل چلانی ہے اس نے باپ دادا کا نام روشن کرنا ہے اسے میری بیوی نے میرے تخم سے جنم دیا ہے وہ گویا کوئی سبق یاد کر رہا تھا۔

(3)

وہ سب قبرستان میں پہنچ چکے تھے۔ اس کے بازوؤں میں بیٹے کی کفن میں لپٹی ہوئی نعش تھی۔ وہ سب قبروں کے بیچ میں راستہ بناتے خاموشی سے چلے جا رہے تھے۔ فضا ساکت ہے۔ پرندے بھی خاموش ہیں جیسے یہ سوگوار منظر دیکھ کر وہ چہچہانا بھول گئے ہوں۔ اچانک یہ سب خود کو کھدی ہوئی قبر کے سامنے پاتے ہیں لیکن یہ قبر تو بہت بڑی ہے۔ وہ حیرت زدہ ہو کر سوچتا ہے پورے چھ فٹ کی قبر جو کسی جوان آدمی کے لئے' اس بچہ کے لئے اتنی بڑی قبر کی کیا ضرورت ہے۔

ابھی وہ یہ سوچ رہا تھا کہ ہاتھوں پر دھری نعش میں حرکت پیدا ہوئی اور بچہ جیسے انگڑائی لے کر بیدار ہو گیا' سب لوگ بھاگ کھڑے ہوتے ہیں یہ انہیں آوازیں دیتا ان کے پیچھے بھاگتا ہے لیکن ایک سیکنڈ میں وہ سب غائب ہو چکے تھے۔ اب وہ قبروں کے درمیان

تنہا ہے اس کا بچہ قدم قدم چلتا اس کی طرف آتا ہے اس کا جسم اب بھی بچے جیسا ہے لیکن وہ یہ جان چکا ہے کہ اس میں بہت زیادہ طاقت بھری ہے' بچہ اسے بالغوں جیسی سنجیدہ آنکھوں سے تک رہا ہے پھر وہ اس کا ہاتھ پکڑتا ہے اور اسے تازہ کھدی قبر کی طرف لے چلتا ہے وہ جانے سے انکار کرنا چاہتا ہے لیکن بچہ اس سے کہیں زیادہ قوی ہے۔ چنانچہ کسی بچہ کی طرح وہ اس کے ساتھ ساتھ کھنچا جاتا ہے۔ قبر کے کنارے پہنچ کر بچہ اسے دھکا دے کر قبر میں گرا دیتا ہے۔ ٹھنڈی مٹی کی خنکی اس کے جسم میں تیر جاتی ہے وہ چیخنے کے لئے منہ کھولتا ہے تو بچہ مٹھی بھر مٹی اس کے منہ میں ٹھونس دیتا ہے۔ اسے اپنا تمام وجود مٹی کی دلدل میں اترتا محسوس ہوتا ہے اور ساتھ ہی یہ احساس بھی کہ بچاؤ کی آخری صورت صرف ایک چیخ میں ہے اور یہ بھی کہ اگر وہ نہ چیخ پایا تو مٹی کے اس بھنور سے زندہ نہ بچ پائے گا۔

وہ چیخ کر بیدار ہو جاتا ہے۔

یہ اس کا پہلا نائٹ میئر تھا مگر آخری نہ ثابت ہوا۔

آہستہ آہستہ گھر سے غم کا بادل چھٹ گیا۔ جمیلہ کو اگرچہ اس کی موت کا بے حد صدمہ ہوا تھا اتنا کہ وہ خود بیمار پڑ گئی تھی مگر بالآخر زندگی نارمل ہو ہی گئی۔ اتنی کہ جب سال بھر بعد وہ عید کے دن فاتحہ خوانی کے لئے قبرستان گیا تو قبر ہی بھول گیا۔ اگرچہ اس نے فاتحہ ایک بچہ ہی کہ ننھی منی قبر پر پڑھا تھا مگر پھر بھی دل میں یہ کھٹکا رہا کہ غالباً یہ قبر جمیل کی نہ تھی۔ اب وہ پچھتا رہا تھا کہ قبر پختہ کرا کر اس پر کتبہ کیوں نہیں لگا دیا تاکہ قبر کے بارے میں کسی قسم کے شبہ کی گنجائش نہ رہتی۔

ان کی زندگی اپنے معمولات کے مطابق گزر رہی تھی۔ گو بظاہر انہوں نے کبھی جمیل کا تذکرہ نہ کیا تھا لیکن دونوں نے اسے کسی نہ کسی انداز سے یاد رکھا تھا' بلکہ اس موضوع پر ان کی مسلسل خاموشی ہی دل کے چور کو ظاہر کرتی تھی۔ جمیلہ سمجھتی تھی کہ بحیثیت ماں وہ ناکام رہی ہے لیکن اس سے بھی زیادہ اسے باپ پر رنج تھا۔ حمل سے لے کر پیدائش تک اور اس کے بعد اس کے مختصر عرصہ حیات کے دوران اس کا طرز عمل ہر لحاظ سے باپ کے منافی تھا۔ لوگ تو پہلے بیٹے کے لئے دعائیں کرتے اور منتیں مانگتے تھے لیکن یہاں معاملہ برعکس ثابت ہوا۔ وہ اس کی ناخوشی کی وجہ نہ سمجھ سکی تھی۔ کیا بیٹا پیدا کرنا گناہ ہے جو یہ اینٹھا اینٹھا

پھرتا تھا مگر جمیل کی موت کا تو اسے بھی بہت صدمہ ہوا تھا۔ مرجھا کر رہ گیا تھا لیکن اس کے باوجود اس کا گزشتہ طرز عمل ناقابل معافی تھا اور وہ اسے اس کی سزا بھی دے رہی تھی۔ وہ کیا' قدرت بھی اسے سزا دے رہی تھی۔ جبھی تو وقتاً فوقتاً راتوں کو چیخ کر بیدار ہو جاتا تھا۔

سزا تو واقعی اسے مل رہی تھی اور وہ خود کو اس کا مستحق بھی سمجھتا تھا۔ اس نے اپنے بیٹے کی قدر نہ کی تھی۔ اس لئے وہ اس سے محروم کر دیا گیا تھا۔ اس نے بیٹے کو رقیب جانا تھا۔ کبھی کبھی اسے یوں محسوس ہوتا گویا اس کا بیٹا مرا نہیں بلکہ اسے قتل کیا گیا ہے اور قاتل وہ خود ہے اس نے اپنی سوچ اور گندے خیالات سے اسے قتل کر دیا تھا۔ اور اب ایک مجرم کی طرح وہ ہر نوع کی سزا بھگتنے کو تیار تھا۔ اس لئے اگرچہ نائٹ میئر اسے ہلا کر رکھ دیتے تھے لیکن اس کے باوجود وہ خوف کی یہ سزا بخوشی برداشت کر رہا تھا۔ اس کے ذہن میں اس سے بہتر کفارہ کا تصور نہ تھا۔ وہ دونوں ایک اور طریقے سے بھی کفارہ ادا کر رہے تھے۔

”پکانے کے لئے کیا لانا ہے؟“

”جو چاہو لے آؤ۔“

”آلو گوشت لے آؤں۔“

”لے آؤ!“

”آٹا ختم ہو گیا ہے۔“

”لے آتا ہوں۔“

”آج جلد آ جانا۔“

”کیوں؟“

”شیخ صاحب کے گھر نہیں جانا؟“

”اچھا۔“

”تمہارے لئے سوٹ کا کپڑا لے آؤں۔“

”نہیں۔“

”کیوں؟“

”کئی مہینے ہو گئے تم نے نیا کپڑا نہیں بنایا۔“

''کوئی فرق نہیں پڑتا۔''

''کچھ پیسے فالتو مل گئے تھے' سوچا تھا تمہیں سوٹ سلوا دوں۔''

''بہت کپڑے پڑے ہیں۔''

''اچھا' سینڈل لا دوں۔''

''رہنے دو۔''

''سینما چلنا ہے؟''

''نہیں۔''

''پکانے کے لئے کیا لانا ہے؟''

''جو چاہے لے آؤ۔''

''بھنڈیاں لے آؤں۔''

''لے آؤ۔''

''نئی جوتی تو نہیں چاہیے؟''

''نہیں۔''

''یہ پھٹا ہوا دوپٹہ پہنے پھرتی ہو۔ نیا دوپٹہ لا دوں؟''

''رہنے دو کیا کرنا ہے۔''

''پکانے کے لئے کیا لانا ہے؟''

''جو چاہے لو آؤ۔''

''بڑا قیمہ لے آؤں؟''

''لے آؤ۔''

ان کی گفتگو اب اتنی نپی تلی تھی گویا دھوبی کو کپڑے دیئے جا رہے ہوں۔ وہ تو ان اجنبیوں کی مانند ہو کر رہ گئے تھے جو سواریوں کے تانگہ پر اتفاقاً شریک سفر ہوں۔

جمیلہ کی آنکھیں اب رنگ نہ بدلتیں۔ ان میں صرف ایک ہی رنگ رہ گیا تھا مگر کھلی آنکھوں کے باوجود وہ اس رنگ کی پہچان سے قاصر تھا۔

رات اور بھی زیادہ تکلیف دہ تھی۔

''جمیلہ''

''ہوں''

''جاگ رہی ہو؟''

''ظاہر ہے۔''

''میں ادھر آ جاؤں؟''

''............''

''بولتی کیوں نہیں؟''

''کیا بولوں؟''

''میاں بیوی آپس میں کیا بولا کرتے ہیں؟''

''مجھے تو پتہ نہیں' کیا بولا کرتے ہیں۔''

''ادھر منہ کرو' میری طرف''

''لو کر لیا''

وہ تختہ بنی لیٹی رہتی۔

''جمیلہ''

''ہوں''

''سو گئی ہو؟''

''نہیں تو''

''میں چلا جاؤں؟''

''چلے جاؤ''

وہ تختہ بنا لیٹا رہتا۔

شرم اور ذلت کے احساس سے اس کا گلا رندھ جاتا۔

اب ایک چھت تلے میاں بیوی نہیں بلکہ دو چار پائیوں پر دو اجنبی جسم ہوتے تھے۔

O.....O.....O

کاٹھ کا شہر

اور تب شاہ نے جو کہ اپنے تئیں شاہ جہان بلکہ شاہِ عالم تھا اور زر و جواہر کے ساتھ عقیدت و احترام کا بھی خراج وصول کرتا تھا' سوچا' اب جب کہ اس کے تدبر اور حکمت و حکومت کا چرچا چار دانگِ عالم میں پھیل چکا ہے اور اطراف و اکناف سے خلق اس کے دیدار سے مشرف اور بہرہ مند ہونے کو آتی ہے اور اب جب کہ ممالک غیر کے عمائدین اس سے رموزِ مملکت کا درس لینے کو حاضر ہوتے ہیں اور اب جب کہ اپنی رعیت کی مغلوبی کے بعد صرف جن و ملک ہی باقی بچے ہیں اور اب جب کہ مملکتِ خداداد کی متعدد مرتبہ تسخیر بھی ہو چکی ہے تو پھر کرنے کو کیا باقی بچا؟

شاہ اپنے اقتدار کے نصف النہار پر تھا!

وہ ہر صبح مثلِ آفتاب بستر ناز سے طلوع ہو کر پہلی انگڑائی لیتا تو بازو گویا شرق تا غرب پھیل جاتے۔ وہ جب شبستان راحت سے پہلا قدم باہر نکالتا تو گویا لرزد زمین و آسمان کی کیفیت پیدا ہو جاتی۔ وہ جب محل سرا میں جانے کو پھولوں سے بھرے راستہ پر بصد ہزار تمکنت گامزن ہوتا تو گویا آسمان جھک کر قدم بوس ہوتا۔ وہ جب شاہی دربار میں مسندِ زرنگار پر کہ تختِ طاؤس جس کے سامنے محض چوب خشک ثابت ہو بصد افتخار سریر آرائے مملکت ہوتا تو ملائک نغمۂ تہنیت گاتے۔

لبِ مبارک سے دانش و حکمت کے جو موتی جھڑتے خلق ان سے دامنِ دل بھر' شاداں و فرحاں ہوتی کہ کارکنانِ قضا و قدر نے ایسے حاکم سے نوازا ہے' والدین سجدہ شکر بجا

لاتے کہ نومولود نے اس سعد سلطنت میں جنم لیا۔

دبدبہ کا یہ عالم کہ انسان تو کجا ہوا بھی سر جھکا کر چلتی اور رعب کا یہ عالم کہ پردار پرواز بھولے!

یقیناً وہ جلیل القدر شاہ تھا اور تواریخ میں مذکور شاہوں سے بھی عظیم تر۔ خود اسے بھی اپنے جلالت مآب ہونے کا ادراک حاصل تھا اور اسی لئے اس سوچ میں غلطاں رہتا کہ اب جب کہ سب کچھ کر لیا تو مزید ایسا کیا کرے جو اس کی عظمت اور ہیبت کے شایانِ شان ہو اور جس کے باعث مورخین کی نسلیں اسے یاد رکھنے پر مجبور ہوں۔ وہ سوچ کی گہرائیوں میں ڈوبا اور ایسا ڈوبا کہ گوہر مقصود حاصل کر کے ہی ابھرا' اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔

مشیروں باتدبیروں' نکتہ طرازوں' دقیقہ سنجوں' عمائدین اور اراکینِ مملکت کو حکمِ حاضری دیا۔ سب مقرر ساعت پر دربارِ خجستہ میں حاضر حضور ہوئے' دست بستہ' خمیدہ سریوں کہ نظریں پاپوش پر' شاہ نے بصدِ افتخار و تمکنت مملکت کے ان رتنوں کو دیکھا اور لبوں کو یوں زحمت گفتار دی۔

''بڑے بڑے نامور' ذی شان اور پُرشکوہ شاہ گزر چکے ہیں اور ان کے کارناموں سے تواریخ معمور ہیں مگر صرف ان ہی شہنشاہوں کا تذکرہ تاریخ میں محفوظ اور منور رہا جنہوں نے کشور کشائی کے ساتھ امورِ مملکت پر بھی توجہ دی اور کچھ ایسا کر گزرے جو آئندہ نسلیں یاد رکھنے پر مجبور ہو گئیں اور مورخ ان کی شخصیت سے صرفِ نظر نہ کر سکا۔''

یہ فرما کر دست بستہ خمیدہ سروں پر نظر دوڑائی تو کہیں چشم نمائی نہ پائی۔ طمانیت کی سانس لی اور پھر گویا ہوئے۔

''ہم نے بھی فیصلہ کیا ہے کہ ایسا کارنامہ سرانجام دیں کہ مورخ ہم سے اغماض نہ برت سکے۔''

دست بستہ اب لب بستہ بھی تھے۔

یہ دیکھ کر سکوت فرمایا' جب چندے یوں ہی سکوت رہا اور شاہ نے مزید کچھ نہ فرمایا تو سب میں تشویش کی لہر دوڑی کہ یہ سکوت کس کلام کا پیشہ خیمہ ہے مگر مجالِ سخن کسے؟

تب مقربِ خاص نے جرات کی' چند قدم بڑھ کر زمین بوس ہو کر یہ التجا کی۔

''آپ کچھ فرمائیے تو...... غلاموں کو ہر طرح سے مستعد پائیں گے۔''

''شاید۔'' شاہ نے تبسم فرمایا۔

''عالی جاہ......''

شاہ کی جنبش ابرو نے مقربِ خاص کو خاموش کر دیا۔

''ہم تمہارے وقوف کا امتحان لے رہے تھے کہ شاید ہماری منشا پہچانو!''

''حضور! ہم اس اہل کہاں؟''

یہ سخن عاجزی سُن کر شاہ نے مزید تبسم فرمایا اور اعلان کیا۔

''ہم نے نیا شہر بسانے کا فیصلہ کیا ہے۔''

سب...... ٹک ٹک دیدم!

''ایسا شہر کہ خلق دیکھے اور عش عش کرے۔''

سب...... دم نہ کشیدم!

''یہ لامثال ہوگا کہ سنگ وخشت سے پاک ہوگا۔''

'یعنی؟'' مقربِ خاص نے جرات سے کام لے کر پوچھا۔

''کاٹھ کا شہر۔''

جھکے سر نہ اُٹھے۔

کیا کبھی تم نے کاٹھ کا شہر دیکھا؟''

''آج تک کسی نے کاٹھ کا شہر نہ دیکھا' نہ سُنا۔''

''بس تو طے!''

لبِ مبارک کا فرمانا اور کام کا شروع ہو جانا۔

اطرافِ عالم میں کاٹھ کے شہر کا شہرہ ہو گیا۔ سب نے یہ جدت سراہی' عقلِ رسا کی داد دی' شاہ کی شہرت چہار اطراف میں پھیلی۔

مملکت کے کل درخت کاٹ ڈالے گئے۔ چیڑ' صنوبر' دیودار' ساگوان سب کٹ گئے یوں کہ مملکت میں کہیں ٹھنڈی چھاؤں نہ رہی۔ گرما کی لُو ناگن بن کر شوکتی' دھوپ نے

ہریالی جُھلسا دی اور شاداب جسموں کی توانائی چوس لی۔ بادل آتا مگر جیسے ناراض گزر جاتا۔ جب پرندوں کے آشیانے کٹے تو انہوں نے دوسری اور سبز بستیوں میں ہجرت کی' ڈھوڑ ڈنگر بھوک سے نڈھال گر گر کر مرنے لگے جن میں سکت تھی انہوں نے بھاگ کر دوسرے خطوں میں پناہ پائی۔

مگر رعایا مستقل مزاج نکلی۔ وہ کہیں نہ بھاگی بلکہ پوری تندہی سے اپنے شاہ کا شہر بسانے کی خاطر آنگن کے پیڑ کاٹتی رہی۔ صاحبِ ثروت اصحاب' شوقین حضرات' رؤسا' امراء' نجیبوں' شریفوں اور اراکین سلطنت وعمائدینِ مملکت نے ممالکِ غیر سے ایسے ایسے نایاب اور قیمتی درخت منگوائے کہ مول میں سونے کے ہم وزن پائے گئے۔

شاہ کیونکہ عزمِ صمیم کا حامل تھا لہٰذا دن رات اس میں منہمک رہتا' اتنا کہ امورِ مملکت سے بھی ہاتھ اُٹھایا' شاہ کو اس میں مستغرق پایا تو اراکین سلطنت اور عمائدینِ مملکت نے کاٹھ کے شہر کی تعمیر ہی کو فرض منصبی جانا اور سب اس میں دل جمعی سے منہمک ہوئے۔ شاہ اور مملکت کے عہدیداروں کا یہ عالم دیکھ کر رعیت بھی اسی رنگ میں رنگی گئی۔

صاحبِ حیثیت لوگوں نے سنگ وخشت کے موروثی مکانات ڈھا کر ان کی جگہ کاٹھ کے گھر بنا لئے صرف غریب غربا' نادار اور مفلوک الحال بسببِ افلاس سنگ وخشت کے قدیم مکانات میں مثلِ ڈھور ڈنگر زندگی بسر کرنے پر مجبور رہے۔

شاہ' عمائدینِ مملکت' اراکینِ سلطنت اور رعایا کے اس جوش وخروش اور ولولہ سے شاداں وفرحاں ہوا اور دساور سے کاٹھ منگوانے کے لئے خزانوں کے منہ کھول دیئے۔

شاہ نے جو کہ مملکتِ خداداد کے ساتھ ذوقِ خداداد کا بھی حامل تھا اپنے خاص محل' دولت خانہ اور دربارِ شاہی کی تعمیر میں بجز صندل کے اور کچھ نہ استعمال کیا جس کی خوشبو سے ہر دم مشامِ جان معطر رہتے۔

الغرض برسوں کی محنت اور قارون کے خزائن سے بھی بڑھ کر زرِ کثیر صرف کرنے کے بعد جب یہ نادرِ روزگار شہر تکمیل کو پہنچا تو جشن کا اعلان کیا گیا۔ دُور دُور سے خلق یہ یگانہ

دھر شہر دیکھنے آئی۔

تب اختر شناسوں، نجومیوں اور رمالوں کی مقرر کردہ سعد ساعت میں شاہ، اراکین، عمائدین رؤسا شرفا اور لشکر شاہی کاٹھ کے شہر میں کاٹھ کے مکانوں میں آباد ہو کر زیست کرنے لگے۔

مگر اس بات کا کسی کو علم نہ تھا کہ کاٹھ کا شہر دیمک کی بستی پر تعمیر ہوا تھا۔

O.....O.....O

کنول کُنڈ

وہ ایسی پر بہار بستی تھی کہ دھرتی پر اس جیسی دل بہار بستی نہ ملے۔ سورج اس ادا سے طلوع ہوتا کہ جو ذرہ جس جگہ ہوتا وہیں آفتاب ثابت ہوتا اور دھرتی کی کوکھ میں سوئے بیج کو نیند سے بیدار کر دیتا یوں کہ وہ سر اٹھا کر ارد گرد پھیلے دھوپ کے نظارہ میں محو ہو جاتا۔ موسم ایسا لطیف اور ہوا ایسی معتدل کہ لوگ دن بھر کھیتوں میں کھلیانوں میں چراگاہوں میں گلیوں میں بازاروں میں، گھروں میں مصروف رہتے، محنت کرتے مشقت کرتے مگر تھکنے کا نام نہ لیتے۔ یوں محسوس ہوتا گویا ہوا کے فرحت بخش جھونکے نرم ہاتھ بن کر پیشانی سے تھکن کا پسینہ پونچھ دیتے، رات آتی تو چاند کی کرنیں گویا کول پنکھڑیوں کے روپ میں بستی میں بکھر جاتیں جس کے نتیجہ میں دن بھر کے تھکے لوگ موتیوں بھرے خوابوں کی سیپیاں چننے کو نیند کے گہرے سمندر میں اتر جاتے۔

جب بستی کی شانت فضا مہک کی پائل پہن لیتی تو پھر ہوا مولسریوں کے گجرے پہن اٹھلاتی اور جب یوں دونوں ایک دوسرے کی سنگت میں تال اڑاتیں تو من پنچھی باولا ہو کر دھمال ڈھالتا آسمان کی نیلاہٹ کنول کنڈ میں اُترتی تو وہ حسینہ کی سپنوں بھری آنکھ میں تبدیل ہو جاتا کھیتوں میں پکی گندم کی بالیوں کا سونا کنواریوں کے سر پر سجے سنہری تاج سے مقابلہ کرتا دبے پاؤں چلتی ہوا کی سرسراہٹ میں ملاپ سمے کی سرگوشیوں کا مزا ملتا۔

بستی کے باسی بہار کی ہوا جیسے معتدل مزاج تھے، بزرگوں کی آنکھوں میں خوردوں کے لئے حسد اور خشونت کی بجائے شفقت ملتی تو چھوٹوں کے اطوار میں ان کے

لئے احترام! زوجہ میاں کی اور بیٹی باپ کی تابعدار تھی اور شرم وحیا کنواریوں کے زیورات تھے۔ ان کے بال ہوا میں نہ اڑتے تھے' نظریں نیچی ہوتیں اور سینے ڈھکے رہتے۔ ان کے لہجہ میں شرافت کی مٹھاس اور باتوں میں حیا کی ملائمت ملتی۔ اس لئے کسی عورت' بیوی' بیٹی اور کنواری یا بیوہ نے ریت رواج کی لکیر پھلانگنے کی کوشش نہ کی تھی یہی وجہ تھی کہ آج تک کسی کنواری کی نہ تو نظر جھکی نہ چال لٹکی' نہ جوانی اٹکی اور نہ ہی روح بھٹکی۔

بستی کے کنارے پر شانت پانی میں سفید' سرخ' نیلے پیلے کنول ہوا کے جھونکوں سے بنتی ٹوٹتی لہروں پر جھولا جھولتے۔ یہ سندر کنول کنواریوں کے بالوں کو سندرتا بخشتے' گھروں کو سجاتے اور معبد کی شوبھا بڑھاتے۔ دور سے دیکھنے پر یہ پھول نہیں بلکہ سبز پتیوں کے بڑے بڑے گول تھال پر رنگوں کے جلتے دیپ معلوم ہوتے' جب چڑھتے سورج کی کرنیں کنول کنڈ کو سونے کی کٹھالی میں تبدیل کر دیتیں تو رنگوں کی چھب کچھ اور ہی ہوتی ایسی کہ ہزار کوشش پر بھی چتر کار اس منظر کو نہ بنا پاتا۔ جب رات کو کنول کنڈ چاندنی کا ہار پہن لیتا تو کنارے بیٹھا کوئی ہزار جتن کرنے پر بھی اس سندرتا کو شبدوں میں بند نہ کر پاتا۔ بستی والے کنول کنڈ کو دیکھتے' بار بار دیکھتے' بدلے زاویوں سے دیکھتے بدلی رتوں میں دیکھتے مگر اس کی من موہنی چھب سے ان کا جی نہ بھرتا۔ یقیناً یہ ان کے لئے سندرتا کا شوالہ ہردے کو شانتی دینے والا شوالہ اور بستی کو مہکا دینے والا شوالہ تھا اور پھر انہونی ہوگئی۔

وہ بھی سہانی صبح تھی' ہوا کے جھونکے بھی شانت شانت تھے اور فضا میں مہک بھی تھی۔ کسی چیز میں کمی نہ تھی' پھر بھی بستی کا بزرگ ٹھٹھک کر رہ گیا۔

گھرے سبز پتے پر شبنم کے موتیوں کے بستر پر ایک بچہ تھا' بزرگ نے آنکھیں مل کر دیکھا شاید یہ نظر کا دھوکہ تھا مگر بچہ وہیں تھا' انہوں نے پوری طرح آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا مگر بچہ وہیں تھا۔ وہ سو رہا تھا' گویا دھوپ کا مہربان ہاتھ اسے تھپک رہا تھا اور ہوا کی نرم انگلیاں سنہری بال سہلا رہی تھیں۔ کنول کے پھول کی مانند بچہ بے لباس تھا اور لال نیلے پیلے پھولوں میں وہ سنہری کنول کی مانند دمک رہا تھا۔

یقیناً میری بوڑھی آنکھیں میرے ساتھ مذاق کر رہی ہیں انہوں نے سوچا اور پھر آنکھیں ملیں مگر گھرے سبز رنگ کے تھال پر شبنم کے موتیوں میں وہ سنہری کنول اسی طرح

کھلا تھا۔ تب ان کی ریڑھ کی ہڈی میں سرد لہر دوڑ گئی۔ یقیناً یہ کوئی پلید روح ہے جو اس پر امن بستی میں بربادی کا بیج بونے کو بھیس بدل کر آئی ہے۔ انہوں نے ردِ بلا کے لئے ورد شروع کر دیا اور عین اسی لمحہ بچہ نے آنکھیں کھول دیں بزرگ کی سال خوردہ گدلائی آنکھیں اور بچہ کی نیلی چمکیلی آنکھیں چار ہوئیں تو مارے خوف کے بزرگ کی رگوں میں دوڑتا خون برف ہو گیا۔ انہوں نے جھرجھری لے کر بچہ کو دیکھا تو محسوس ہوا کہ وہ مسکرا رہا ہے وہ بالکل سہم گئے اور پھر یوں لگا جیسے وہ کلکاری مار کر ہنس دیا ہے۔ اب ان میں بیٹھنے کی سکت نہ رہی چنانچہ وہ بھاگے۔ اپنی پوری قوت سے بوڑھی لرزتی ٹانگوں کو دوڑائے۔ انہیں یوں محسوس ہوا کہ آوازیں دیتا بچہ بھی پیچھے پیچھے بھاگتا آ رہا ہے مڑ کر دیکھا مگر نہیں یہ محض خوف کی آوازیں تھیں۔ انہوں نے خوف سے سن ہوتی ٹانگوں کو اور زیادہ تیز کر دیا' اگرچہ ہر قدم پر یوں محسوس ہوتا گویا بچہ کی پکار ٹانگوں سے لپٹ رہی ہو' مگر وہ بھاگتے رہے' اس پلید روح سے اپنی پاک روح کو بچانے کے لئے وہ اسی طرح بھاگتے رہے اور خوف سے پھیلی پتلیوں سے مڑ مڑ کر بھی دیکھتے رہے حتیٰ کہ بستی کے چوراہے میں دھڑام سے گر گئے۔ جب سانسیں مرتب ہوئیں تو مٹی میں اٹا منہ اٹھایا تو خود کو بستی والوں کے دائرہ میں پایا اور سب احوال سن کر جب لوگ کنول کنڈ کی جانب بھاگے تو ہتھیار لے جانا نہ بھولے' جنہوں نے اسے بد روح جانا وہ مسلسل ورد کر رہے تھے' بعض کو توقع تھی کہ یہ چھلاوہ ہوگا جو جون بدل کر ڈرانے آیا اور اب غائب ہو چکا ہوگا مگر نہیں' وہ موجود تھا۔ سنہری بالوں کا تاج پہنے' شبنم کے موتیوں سے بھرے سبز تھال پر سنہری کنول!

سب ٹھٹکے کھڑے تھے!

کون ہے یہ؟ بدروح' چھلاوہ یا بلا؟ نہیں۔ محض بچہ ہے۔ جب یہ طے ہو گیا کہ یہ انسان ہی کا بچہ ہے تو پھر یہ بھی ثابت ہو گیا کہ یہ کنول کا نہیں بلکہ بدی کا پھول ہے۔ خوبصورت تن کے باوجود ناجائز وجود ہے اور سندر مکھڑے کے باوجود گناہ کا انگارہ ہے۔

مگر کس کا؟

اس کا جواب نہ مل سکتا تھا اس لئے یہ سوال ہی بے کار تھا لہٰذا اس سے چھٹکارے کی تدابیر پر غور شروع ہوا۔

"پھانسی دو۔"

"مگر رسی کس گھر سے آئے گی؟"

"گلا گھونٹو!"

"مگر کس کے ہاتھوں سے؟"

"جلا دو!"

"مگر چتا کو آگ کون دکھائے گا؟"

اور تب بستی کے سب سے معمر، دانش مند اور مدبر بزرگ نے مشورہ دیا اسے پانی کی اسی قبر میں میں اتار دو!

مگر کیسے؟

"سب مل کر پتھر مارو" تجربہ کار دانا بزرگ نے کہا۔ یہ معاملہ کیونکہ مردوں کا تھا اس لئے کوئی بھی عورت شریک نہ تھی۔ سب نے مارنے کو پتھر اُٹھائے ہی تھے کہ ایک نامانوس خوشبو نے جیسے ہاتھ پکڑ لئے۔ چلنے میں بستی کی کسی عورت کی پائل یوں نہ چھنکتی تھی، نہ ہی کسی گھر والی کے کنگن یوں کھنکتے تھے۔ سب نے ہاتھ نیچے کئے بغیر گردنیں موڑ کر دیکھا اور نظریں جھکا لیں وہ جس لباس میں تھی کسی شریف زادی نے کبھی زیب تن نہ کیا تھا وہ جس لٹکے سے چل رہی تھی اس طرح اور کوئی عورت نہ چل سکتی تھی اور وہ جن نظروں سے انہیں دیکھ رہی تھی کسی بیاہتا نے بھی اپنے مرد کو کبھی یوں نہ دیکھا ہوگا۔

وہ زنِ فاحشہ تھی جسے کالے کرتوتوں کی وجہ سے بستی کی حد میں داخلہ کی اجازت نہ تھی۔

"خبردار" وہ گرج کر بولی۔

دانشمند بزرگ بولا اگرچہ اس گندی عورت سے بات کرتے وقت اسے کراہیت کا احساس ہو رہا تھا۔

"تم کیوں بچانا چاہتی ہو؟"

"اس لئے کہ یہ انسان کا بچہ ہے۔ کیا یہ وجہ کافی نہیں؟"

"یہ ناجائز وجود ہے۔"

"بستی کو ناپاک کر دے گا۔"

"ہم پر قہر آئے گا۔"

"مصیبتوں کی فصل کاٹنی پڑے گی۔"

وہ ہنستی رہی جب سب اپنی اپنی کہہ چکے تو وہ استہزا سے بولی۔

"تم دیکھ سکتے ہو کہ یہ میرا نہیں۔"

"یعنی؟"

"میں بستی کی حد سے باہر بستی ہوں۔"

"تو؟"

"اور تم سب ایک دوسرے کے ساتھ رہتے ہو۔" اس نے ان کے متوحش چہروں پر نگاہ دوڑائی اور پھر ہنس کر بولی۔ "میرے ساتھ تو نہیں رہتے" اس نے اس مرتبہ خاموش مردوں کے ہاتھوں کے پتھروں کو دیکھا۔ "تمہیں تو میرا احسان مند ہونا چاہیے کہ میں تمہارا کام کر رہی ہوں۔"

"کیا بکتی ہے؟"

"حرافہ"

"چھنال"

"کٹنی"

"پچھل پائی"

مگر وہ ان کی گالیوں کی سنگساری سے بے نیاز آگے بڑھتی ہے اور آہستگی سے کنارہ پر بیٹھ کر بڑی احتیاط سے اپنا ہاتھ بچے کی طرف بڑھاتی ہے۔ سینکڑوں آنکھیں کنول کے ڈنٹھل کو اس کی جانب آہستہ آہستہ کھنچتا دیکھ رہی ہیں پھر وہ اسے نہایت محبت سے اٹھا کر اپنے سینہ سے لگا لیتی ہے۔ اب جو وہ اُٹھی تو یوں محسوس ہوا گویا آسمان تک اُٹھتی گئی، مڑی تو گردن میں کسی فاتح جیسا وقار اور چلی تو چال میں شاہانہ تمکنت۔

نظروں کے ساتھ ساتھ مردوں کے پتھر والے ہاتھ بھی جھک گئے۔

O.....O.....O

احمق کٹھ پتلی

اور پھر چلتے چلتے وہ ایک ایسے جنگل میں آ پہنچا جہاں کی فضا میں رنگوں کی پچکاریاں اور جھونکوں کے دامن خوشبو سے بھرے تھے آسمان نیلا تھا مگر اس کی نیلاہٹ چمک کا کچھ اور ہی انداز لئے تھی۔ گھاس سبز تھی مگر اس کی ہریالی اپنے اندر الگ بہار لئے تھے۔ سر کشیدہ درختوں کے گول تنوں میں عجب نرماہٹ اور گرمی سی تھی۔ کومل پتوں سے سجی شاخیں یوں پھیلیں گویا بازوؤں میں لینے کو تیار ہوں۔

وہ کسی درخت کی مانند ٹھٹھکا کھڑا رہ گیا!

یہ کیسا جنگل تھا؟ یہ کیسی فضا تھی؟ یہ کیسی باس تھی؟

اس نے درخت کے کومل تنے پر ہاتھ پھیرا تو اسے تن کی طرح دھڑکتا پایا۔ اسے اپنے پھیلے ہاتھوں کے نیچے درخت کی رگوں میں خون کی گردش محسوس ہو رہی تھی۔ درخت جیسے اس کے لمس سے لرز رہا تھا۔ وہ کتنی دیر تک درخت کے تنے سے لپٹا ہوا کی سرگوشیاں سنتا رہا اور تب اسے احساس ہو گیا کہ اس کی تلاش ختم ہوئی اور یہ جنگل اور یہ درخت اس کی منزل ہے۔

اس نے ایک ایک کر کے اوزار نکالے اور درخت کاٹنا شروع کیا۔ وہ اس احتیاط سے کام کر رہا تھا گویا اپنا جسم کاٹ رہا ہو۔

اب جب کہ وہ منزل تک پہنچ چکا تھا اور اپنے مقصد کی تکمیل میں محو تھا تو اس کی

بے چینی اور اضطراب بھی ختم ہو چکا تھا۔ اب صرف کام کا انہماک تھا۔

اس کے مشاق ہاتھ اور نازک اوزار لکڑی کے سڈول ٹکڑے کی کایا پلٹ رہے تھے۔ پہلے سر بنا، پھر گردن، پھر بازو، دھڑ اور ٹانگیں اور جسم تیار تھا۔ تب اس نے نہایت محنت سے موٹی موٹی آنکھیں، کھڑی ناک اور بھرے بھرے ہونٹ بنائے۔

دن ختم ہونے کو آیا۔ شام کے سائے پھیلتے گئے۔ رات کے آرام سے پہلے پنچھی آخری مرتبہ بول رہے تھے۔ پُروائی میں گھل کر جنگل کی باس گویا لوری دے رہی تھی۔ مگر وہ چاہنے پر بھی سونے سے قاصر تھا۔ وہ چاند کی روشنی میں رات بھر کام میں مگن رہا۔ اس نے مکئی کے بھٹے سے سنہری بال لئے اور انہیں اس کے سر پر سونے کے تاج کی مانند سجا دیا۔ اس نے گلاب سے سرخی لے کر اس کے لبوں پر لالی سجا دی۔

چاند رات بھر یہ منظر دیکھتا رہا اور وہ رات بھر کام کرتا رہا اور جب سورج کی پہلی کرن سنہری بالوں پر ناچی تو وہ کام ختم کر چکا تھا مگر مسلسل کام کی تھکن کی بجائے وہ عجب سرشاری کے عالم میں تھا۔ اس نے نیم وا آنکھوں سے اسے دیکھا، اس کا شاہکار مکمل تھا۔

وہ ایسی کٹھ پتلی بنانے میں کامیاب ہو گیا تھا جو سچ مچ کی عورت معلوم ہوتی تھی۔ یوں محسوس ہوتا گویا وہ انگڑائی لے کر اور بڑی بڑی آنکھیں جھپکا کر اپنے بکھرے ہوئے سنہری بال سمیٹ کر گردن کے پیچھے کرے گی۔ وہ اُسے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا گویا اس سے پہلی مرتبہ ملا ہو۔

''کیا دیکھ رہے ہو؟'' وہ آواز سن کر اُچھل پڑا۔ کیا درخت بولا تھا یا ہوا؟ مگر نہیں، یہ وہ تھی۔ اُسے اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے گھور رہی تھی وہ اُسے منہ کھولے دیکھتا رہ گیا۔

''کیا دیکھ رہے ہو؟'' اس نے پھر پوچھا۔

''تمہیں۔''

''مجھے؟''

''ہاں ہاں تمہیں''

''مگر کیوں؟ مجھے تو تم نے ہی بنایا ہے۔''

''وہ تو ٹھیک ہے مگر.....'' اس نے خود کو اس کی بھنوراسی سیاہ آنکھوں کی گہرائی

میں گم ہوتے پایا اور فقرہ ادھورا رہ گیا۔

وہ آہستگی سے بولی ''تم نے مجھے کیوں بنایا؟''

''میرے ذہن میں تمہاری تصویر تھی اور یہ تصویر ایسی مکمل تھی کہ میں تمہیں ہر وقت ساتھ پاتا۔ اپنے قریب محسوس کرتا۔ حتیٰ کہ میں کام کاج کے قابل بھی نہ رہا اور تب میں نے ارادہ کر لیا کہ میں تمہیں بناؤں گا اور تم ایسی مکمل ہو گی کہ دنیا دیکھے گی۔''

''کیا میں مکمل ہوں؟''

''ہاں! تم ہر لحاظ سے مکمل ہو۔''

وہ کچھ دیر خاموش رہی گویا اس کی بات کا مطلب سمجھ رہی ہو۔ پھر بولی۔

''مگر میں ہوں کون؟''

وہ ہنسا۔ ''بھئی! تم ایک کٹھ پتلی ہو۔''

''کٹھ پتلی؟''

''ہاں ہاں! کٹھ پتلی۔''

''مگر یہ کٹھ پتلی کیا ہوتی ہے؟''

''اب میں تمہیں یہ سب کیسے سمجھاؤں؟ دیکھو! اسے یوں سمجھو۔ تمہیں میں نے اس درخت کی لکڑی سے بنایا ہے۔ میں نے بنایا ہے میں نے ...... سمجھ گئی؟''

''ہاں، اتنا تو سمجھ گئی۔ مگر اب جب کہ میں بن گئی ہوں تو میرا بنے گا کیا؟''

''بنے گا کیا؟ ارے بھئی تم ناچو گی۔''

''ناچوں گی مگر کیوں؟''

''بھئی، تم کٹھ پتلی جو ہو اور میں نے تمہیں بنایا جو ہے۔''

وہ کچھ دیر تک پھر خاموش رہی۔ گویا اس نئی اطلاع پر غور کر رہی ہو۔ پھر بولی۔

''اگر میں ناچنا نہ چاہوں، تو؟''

''مگر اس میں تمہاری مرضی کو کوئی دخل نہیں''

''کیوں، ناچنا تو میں نے ہے، ہے نا؟''

''مگر تمہاری ڈور تو میرے ہاتھ میں ہو گی، اس لئے جس طرح میں ڈور ہلاؤں گا

تم اس طرح ناچو گی۔ ناچو گی کیا۔ ناچنے پر مجبور ہو گی۔''

یہ سن کر جیسے وہ سناٹے میں آ گئی۔ ''تو یہ بات ہے؟''

''ہاں یہ بات ہے۔''

''مگر ایسا کیوں؟''

''ایسا اس لئے کہ ہم کٹھ پتلی نچانے والے ہیں، یہ ہمارا پیشہ ہے۔ تمہیں نہ نچائیں تو روٹی کہاں سے کھائیں؟''

''تو ہم صرف روٹی کمانے کا ذریعہ ہیں؟''

''بالکل!''

''ان سنہری بالوں اور ان سیاہ آنکھوں کے باوجود؟''

''ان سنہری بالوں اور کالی آنکھوں کی وجہ سے تو اور بھی زیادہ لوگ تماشا دیکھنے آئیں گے۔''

''مگر میں کٹھ پتلی بن کر ناچنا نہیں چاہتی! اپنی مرضی سے اور اپنی خوشی سے ناچنا اور بات ہے مگر ڈور سے بندھ کر ناچنا مجھے پسند نہیں میرے لئے کچھ اور سوچو!''

''یہ تم سچ کہہ رہی ہو۔''

''ہاں!''

وہ خاموشی سے سر جھکائے سوچتا رہا۔ پھر بولا ''ایک صورت ہے۔''

''وہ کیا؟''

''میں نے تمہیں اپنے ہاتھوں سے بنایا ہے۔ تمہاری صورت بھی بہت اچھی ہے اس لئے میں تمہیں اپنی بیوی بنا سکتا ہوں۔''

''بیوی؟'' وہ بولی۔ ''یہ ایک اجنبی لفظ ہے، اس کا کیا مطلب ہے؟''

''بیوی ...... بیوی ...... بس بیوی بیوی ہوتی ہے۔''

''میں کچھ سمجھی نہیں''

''دیکھو بھئی، عورت اور مرد کیونکہ اکٹھے نہیں رہ سکتے اس لئے وہ خاوند اور بیوی بن کر رہتے ہیں۔''

"اوہ!"

"ہاں!"

"اور بیوی بن کر مجھے کیا کرنا ہوگا؟"

"کچھ بھی نہیں۔"

"ڈور سے ناچنا تو نہیں پڑے گا؟"

"ہرگز نہیں۔ بیوی اور کٹھ پتلی میں بڑا فرق ہوتا ہے۔"

"چلو ٹھیک ہے۔ مگر بیوی کس کام آتی ہے؟"

"کسی کام نہیں آتی۔ بس خاوند اپنی بیویوں سے پیار کرتے ہیں۔"

"تم بھی پیار کرو گے۔"

"ہاں، کیوں نہیں۔ میں تمہیں اچھے اچھے کپڑے سلوا کر دوں گا۔ میں تمہارے لئے سونے اور چاندی کے گہنے لاؤں گا۔ میں تمہیں اچھے سے گھر میں رکھوں گا۔"

"اور تم..... تم اُس گھر میں نہیں رہو گے؟"

"میں بھی یہیں رہوں گا۔ میں سارے دن کے کام کاج، محنت اور بھاگ دوڑ کے بعد شام کو گھر ہی میں تو آؤں گا۔"

"اچھا! اور پھر؟"

"پھر کچھ بھی نہیں۔ بس تمہیں یہ کرنا ہوگا کہ گھر کو اچھی طرح سے صاف ستھرا رکھو۔"

"وہ کیوں؟"

"بھئی تم بیوی جو ٹھہریں۔"

"اچھا! اور کیا کیا کرنا ہوگا؟"

"کچھ نہیں۔ بس کھانا پکا کر گرم رکھنا تاکہ جب میں تھکا ہارا گھر آؤں تو مجھے گرم گرم کھانا ملے۔"

"وہ کیوں؟"

"بھئی تم بیوی جو ٹھہریں"

"اچھا! اور کیا کیا کرنا ہوگا؟"

"کچھ نہیں، بس کبھی کبھی..... میرا مطلب ہے کہ بعض راتوں کو....."

"وہ کیوں؟"

"بھئی تم بیوی جو ٹھہریں۔"

"اچھا! اور کیا کیا کرنا ہوگا؟"

"کچھ نہیں۔ بس جب بچے پیدا ہوں گے تو ان کی دیکھ بھال اور پرورش....."

"اور.....؟"

"پھر اور بچہ....."

"اور؟"

"اور شاید پھر اور بچہ....."

"کب تک؟"

"عمر بھر!"

وہ ایک دم چیخ کر بولی۔ "میں بیوی نہیں بنتی۔ میں بیوی نہیں بنتی۔"

"مگر کیوں؟"

"یہ بھی کوئی زندگی ہے۔"

اب وہ بھی غصہ میں بولا۔ "احمق کٹھ پتلی۔ تو شاید جانتی نہیں کہ اپنی بیوی بنا کر میں تمہیں کتنی بڑی عزت دے رہا ہوں۔"

"نہیں! مجھے اپنی زندگی اور آزادی کی قیمت دے کر عزت کا یہ سودا منظور نہیں ہے۔"

وہ اب غصہ کی شدت سے کانپ رہا تھا۔ "تمہیں پتہ نہیں تم کس سے بات کر رہی ہو؟ مت بھولو کہ میں نے تمہیں بنایا ہے۔" کٹھ پتلی نے کچھ کہنے کو منہ کھولا، مگر کاٹھ کا منہ نہ کھل سکا۔ اس نے پلکیں جھپکا کر آنکھوں میں آئے آنسو بہانا چاہے مگر کاٹھ کی آنکھوں میں آنسو کہاں؟

O.....O.....O

مردہ دھار والی مقراض

بستی کے تمام مرد دائرہ در دائرہ مانند تصویر تھے۔ لب خاموش مگر آنکھیں نفرت و حقارت کی زبان، گردنوں کی پھولی رگوں میں رُکا ہوئے غیض وغضب، بعض ماتھے شکنوں کے جال تو کچھ غصیلی مٹھیوں میں کھنچاؤ۔ یوں کہ پوروں میں خون اُتر آیا اور بازوؤں کی رگیں رسیوں میں تبدیل ہوگئیں۔

جب خشونت بھری آنکھیں، خاموش لبوں کی حقارت اور سختی سے بھنچے جبڑوں کے غیض سے بننے والے دائرہ میں اُسے لایا گیا تو تنے اعضا میں کراہت کی لہریں دوڑ گئیں یوں کہ عضلات اور بھی تن گئے۔ غصہ نے سب پر کپکپی طاری کر دی۔ پُرخشونت نظروں کی گرم سلاخوں سے داغے جانے والے جسم میں لرزش تھی۔ وہ کسی بچی کی مانند تھی۔ جسم چرائے نظریں جھکائے، اپنے خوف کی اسیر، گرم بھوکی کی جوالا نظروں میں کانپتی چٹختی لکڑی مثال!

وہ خاموش، مرد خاموش۔ فضا خاموش!

آنکھوں کے قفس سے پلکوں کے پٹ ہٹے تو سہمی چڑیا جیسی نظروں نے مردوں کی فصیل سے اونچا اڑنا چاہا۔ نظریں دائرہ میں کھڑے مردوں کے چہرے ٹٹولتی رہیں مگر تنے جبڑوں، بھنچے ہونٹوں اور شکنوں بھری پیشانیوں میں اس کے لئے رحم نہ تھا۔ نفرت نے ان کے دلوں پر مُہر لگا دی تھی جس سے بھی آنکھیں چار ہوتیں اس کی آنکھوں میں خون اُتر آتا۔ زخمی پروں والی سہمی چڑیا جیسی نظریں پناہ کے لئے چہروں کے پتھریلے نقوش پر منڈلاتی رہیں اس سرے سے اُس سرے تک بے سود! رحم نا آشنا آنکھوں کی سرد خشونت

سے جسم میں جھرجھری دوڑ گئی۔

بستی کے تمام مرد دائرہ در دائرہ تھے مگر اس کا باپ اور بھائی نہ تھا ظاہر ہے کہ وہ اس کی بے حیائی کے کیسے شاہد بن سکتے تھے۔

بستی کا معمر ترین اور اسی لئے معتبر مرد آگے بڑھا۔ اس کے ساتھ چوبی صندوق اٹھائے ایک اور معزز مرد تھا۔ گئے زمانوں کی گرد اور گزرے مردوں کے ہاتھوں کی میل نے مل کر چوبی صندوق کو جو رنگت دی تھی وہ کسی اور صندوق کو نہ مل سکتی تھی جو دائرہ کے درمیان رکھ دیا گیا اور ایک سال خوردہ مرد نے لباس کی تہوں سے ایک زنگ آلودہ چابی برآمد کی۔ یہ چابی بڑے احترام کے ساتھ بستی کے معمر ترین اور اسی لئے معتبر مرد کو پیش کی گئی۔ جس کے ہاتھ غصہ سے (یا پھر رعشہ) سے کانپ رہے تھے وہ جھک کر چوبی صندوق کا سال خوردہ قفل کھولنے لگا۔

لڑکی کی خوف سے پھیلی پُتلیاں قفل کھولنے میں کانپتے ہاتھوں پر جمی تھیں جن پر اُبھری ہوئی موٹی موٹی اور نیلی رگوں کا جال بنا تھا۔ دائرہ در دائرہ مرد بھی جیسے چوبی صندوق قفل، چابی اور کھولنے والے ہاتھ دیکھ رہے تھے۔ ہاتھ کی لرزش کی وجہ سے چابی قفل کے بند سوراخ میں داخل ہوتے ہوتے رہ جاتی مردوں کی سانسیں رُکی ہوئی تھیں، لڑکی کا دل یوں دھڑک رہا تھا گویا چابی دل کے سوراخ میں داخل ہو رہی ہو۔

آخر قفل کھل گیا۔

سب کے سینوں میں رُکی سانسوں کی آبشار جاری ہوگئی۔ زنگ لگے قبضوں کی چڑچڑاہٹ کی نامانوس آواز کے ساتھ صندوق کا ڈھکن اُٹھتے ہی سب نے گردنیں آگے کر کے گویا صندوق میں جھانکنا چاہا۔ پچھلے دائرے والے پنجوں کے بل اور اونچے ہوگئے۔ ان کے پیچھے کھڑے مردوں نے اور اونچا ہونے کی کوشش کی۔ ان کے پیچھے کھڑوں نے ان سے بھی زیادہ اور ان کے پیچھے کھڑوں نے ان سے بھی زیادہ!

ہزاروں نظریں صندوق پر مرکوز تھیں، ان نظروں کی گرمی سے صندوق پگھل نہ گیا تو صرف اس لئے کہ یہ گوشت پوست کا نہیں محض لکڑی کا بنا تھا۔

اب رعشہ دار ہاتھ صندوق میں تھا وہ کچھ ٹٹول رہا تھا اور جب وہ باہر نکلا تو اس

میں پرانی وضع کی ایک بہت بڑی مقراض تھی۔ یہ اگر بڑی تھی تو اس لئے کہ یہ بھیڑوں کی اون کاٹنے والی تھی۔ اب یہ الگ بات ہے کہ عرصہ دراز سے اس سے کسی بھیڑ کی اون نہ کٹی تھی۔

اب تک لڑکی کا جسم کپکپا رہا تھا مگر مقراض دیکھتے ہی وہ گویا مجسمہ کی طرح بے حرکت ہوگئی۔ ہزاروں نظریں مقراض پر مرکوز تھیں۔

اور مردہ دھار دھوپ میں لرز رہی تھی۔

ایک مرتبہ پھر کانپتا ہاتھ صندوق میں گیا اور رکی سانسوں کے شور میں جو برآمد کیا اسے دیکھ کر لڑکی چیخی!

اسے رسہ کہیں یا طویل چٹیا؟ سنہری بال، سیاہ بال، سفید بال، سرخ بال، اخروٹ کے رنگ کے بال، کھچڑی بال، ہر رنگ کے بالوں سے گندھی چٹیا۔ لڑکی ایک مرتبہ پھر چیخی یہ رسہ تھا یا چٹیا، جو بھی تھی اب کپکپاتے ہاتھوں میں مردہ سانپ تھی۔

لڑکی پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس رعشہ خوردہ ہاتھ کو اپنی جانب بڑھتے دیکھ رہی تھی۔ غیرارادی طور پر وہ دو تین قدم پیچھے ہٹ گئی۔ کھلی مقراض نہ تھی خنجر کی نوک تھی۔ نیم وا ہونٹوں میں سے دو تین دانت نظر آرہے تھے اس نے چیخنے کو منہ کھولا مگر کھلے منہ سے چیخ نہ نکل سکتی تھی کہ طاقتور ہاتھ جکڑ چکے تھے۔ اس کی چلتی ٹانگیں دو مضبوط ہاتھوں کے شکنجہ میں تھیں۔ ہلتے بازو کسی اور کے بازوؤں میں بے بس تھے۔ منہ میں کپڑا ٹھونسا گیا اور پھر بڑی مشکل سے ہاتھ اور پاؤں رسی سے باندھ دیئے گئے۔

رعشہ زدہ ہاتھوں نے مردہ دھار والی مقراض سنبھالی اور لڑکی کے بال کاٹنے شروع کئے۔ رات کے دل جیسے سیاہ بالوں کی لٹیں گر رہی تھیں، ایک کے بعد ایک، رکی ہوئی سسکیوں سے لڑکی کا سارا جسم بری طرح کانپ رہا تھا۔ مردہ دھار کچی کچی جوانی کے رس میں ڈوبی چمکیلی لٹوں کا ڈھیر لگا رہی تھی،

یہ نیک کام ختم ہوا۔

ایک اور معتبر نے یہ لٹیں جمع کیں اور انہیں بالوں کے رسہ میں گوندھنے لگ گیا۔

لڑکی مردوں کے نرغہ میں تھی جو اسے جنگل کے اس حصہ کی جانب ہانک رہے

تھے جہاں درختوں کی شاخوں نے باہم مل کر پتوں کی جو چھت بنائی تھی وہ اتنی گھنی تھی کہ دوپہر کے سورج کی کرنیں بھی پار نہ ہوسکتی تھیں اور اس چھت کی زینت بڑھانے کو چیلوں جتنی چمگادڑیں تھیں۔ اس مسلسل اندھیرے میں اُگنے والی بیلوں پر مردہ پرندوں کے ڈھانچوں کے پھول کھلے تھے کہ ان بیلوں کے جال میں جو پرندہ پھنسا وہ پھر اُڑ نہ سکا۔ ان بیلوں سے جو جگہ بچی وہاں زہریلی مکڑیوں کے جالے تھے۔ تنوں اور زمین پر غیر معمولی جسامت کی چھپکلیوں کا راج تھا ایسی خونخوار کہ سانپوں سے بھڑ جاتیں۔ اس ملگجی اندھیرے میں ایسے پودے تھے جن کی مہک پر جانور آتے تو شاخیں انسانی بازوؤں کی مانند انہیں جکڑ لیتیں۔ تب پودے سے ایسا لیسدار لعاب خارج ہوتا کہ وہ اس میں تحلیل ہوکر پودے کی رگ رگ میں سما جاتے، اجڑے درختوں کی جڑ میں سیاہ اور سرخ چیونٹیوں میں گھمسان کا رن پڑتا۔ فاتح چیونٹیاں کھوکھلے تنے پر قابض ہوجاتیں اور اس تمام منظر پر ایک اندھا الو پہرہ دیتا۔

(2)

وہ نیک اور پاک لوگوں کی بستی تھی وہ اتنے نیک اور پاک تھے کہ وہاں سے گزرنے کے دوران ہوا اپنی آلودگی سے پاک ہوجاتی۔ باکردار لوگوں کی اس بستی میں آسمان زیادہ چمکیلا تھا، پھول زیادہ مہکار والے اور ہوا زیادہ مفرح تھی اور فضا بیماریوں کے لئے صحت بخش۔

وہ اپنے بزرگوں کا احترام کرتے، بچوں سے پیار کرتے، جانوروں پر ظلم نہ ڈھاتے، بھٹکے مسافروں کی دلجوئی کرتے، اجنبی کے لئے گھر کے دروازے کھول دیتے، بھوکوں کو کھانا کھلاتے اور ان سب خوبیوں کے ساتھ ساتھ عورتوں کو ان کی اوقات پر رکھتے۔ بستی کے مردوں کے اجتماعی سکون کے لئے یہ بہت ضروری تھا، اگرچہ عورت کے بغیر گزارہ بھی نہ تھا مگر اس کے چھل فریب سے بچنا بھی لازم تھا۔ دراصل وہ لازمی شر تھی اس لئے اس کے ساتھ برتاؤ میں بھی اس احتیاط کی ضرورت تھی جو آگ کے کھیل کے لئے ضروری ہوتی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ گھر سے باہر نکلتے تو شئے مسروقہ کی مانند اسے تالہ میں بند کر جاتے اور پھر گھر میں داخل ہونے سے پہلے چابک ساتھ لے جانی نہ بھولتے۔ اتنی سختی اور احتیاط کے

باوجود بھی بعض عورتوں میں اتنا شر بھرا ہوتا کہ وہ کسی نہ کسی بھولے مرد کو شرافت کی راہ سے بھٹکا کر اپنے جسم کا غلام بنا لیتیں۔ شر کے رس میں ڈوبی ایسی عورتوں سے باکردار مردوں کو بچانے کا ایک ہی طریقہ تھا کہ شر کو فوراً کچل دیا جائے اور وہ بھی عبرت انگیز طریقے سے!

ان کے پُرکھوں نے عظیم دانائی سے کام لے کر سزا کا جو طریقہ وضع کیا وہ اس صندوق اور مقراض کی صورت میں نسلوں کے اجتماعی انصاف کا مظہر تھا۔ اب یہ الگ بات کہ اس کے باوجود بھی عورت اپنے جسم کا زہر پھیلانے سے باز نہ آتی لیکن یہ بھی طے ہے کہ ایسا بہت کم ہوتا۔ کبھی کبھار ایک نسل میں شاید ایک بار یا دو بار۔

الغرض! وہ باکردار، باشعور اور انصاف پسند لوگوں کی بستی تھی، اس لئے وہاں بارش وقت پر ہوتی، سورج صرف اتنی گرمی دیتا جتنی فصلوں کے پکنے کے لئے ضروری ہوتی، ہوا میں صرف اتنی خنکی ہوتی جتنی انسانی جسم کے لئے فرحت بخش ہو، آندھی حدِ اعتدال سے نہ بڑھتی اور یہ برکتیں صرف اور صرف اس لئے تھیں کہ وہ عورت کے شر کو سمجھتے تھے اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ وہ اس کے جسم کے زہر کو وبا کی طرح پھیلنے سے روکنے پر قادر بھی تھے۔ چور اور قاتل کے لئے شاید عفو ہو سکتی ہو، مگر مرد کو جسم کی دلدل میں پھنسا لینے والی عورت کے لئے فوری مؤثر اور عبرت انگیز سزا تھی۔

آج پھر ناشُدنی کی سزا کا دن تھا!

بستی کے تمام مرد دائرہ در دائرہ مانند تصویر تھے۔ لب خاموش مگر آنکھیں نفرت و حقارت کی زبان، گردنوں کی پھولی رگوں میں رُکے ہوئے غیض و غضب کا تناؤ، بعض ماتھے شکنوں کے جال تو کچھ غصیلی مُٹھیوں میں کھنچاؤ یوں کہ پوروں میں خون اُتر آیا اور بازوؤں کی رگیں رسیوں میں تبدیل ہو گئیں۔ سب سے مدبر مرد کے خارشی ہاتھوں نے مردہ دھار والی مقراض سنبھالی اور لڑکی کے بال کاٹنے شروع کئے اور جلد ہی مکّی کے بھٹے جیسے کومل اور چمکیلے بالوں کا سنہری آبشار زمین پر بہہ گیا۔

جب کام ختم ہوا۔ سب نے اطمینان کی طویل سانس خارج کی۔ تنے عضلات اب ڈھیلے پڑ رہے تھے کہ اچانک انہوں نے خوف اور بے چارگی سے روتی لڑکی کی آنکھوں میں عجب رنگوں کی پچکاریاں چلتی دیکھیں، لڑکی کے لبوں پر مسکراہٹ کی شرمیلی کرن نے

گرد آلود اور آنسو بھرا چہرہ منور کر دیا۔

مسلسل دائروں میں کھڑے مردوں کو اپنی پشت پر شور کا احساس ہوا اور مڑ کے دیکھنے پر ان سب کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ بستی کی تمام عورتیں سینہ تانے درانہ چلی آ رہی تھیں اور ان سب کے منڈے ہوئے سروں پر سورج جس طرح چمک رہا تھا وہ آج تک اور کسی شے پر یوں نہ چمکا ہوگا۔

O.....O.....O

جس رات ستارے ٹوٹے

..... اور پھر عجب دہشت ناک انہونی ہوگئی کہ اماوس کے بعد چاند طلوع نہ ہوا۔ بستی کے بوڑھوں کی یاد کی تاریخ میں ایسا کبھی نہ ہوا تھا۔ قحط پڑے' وبائیں پھوٹیں' سیلاب آئے' خشک سالی ہوتی اور ان سب نے مل کر انسانی جانوں کا تاوان بھی وصول کیا۔ ان سب سے انسانوں کا جنم جنم کا ساتھ رہا ہے اور بستی والے ان کے عادی تھے مگر اس انہونی نے تو دہلا کر رکھ دیا تھا اور یہ اتنا غیر متوقع تھا کہ آج تک کبھی یہ سوچا بھی نہ تھا۔ حسب معمول چاند کی ٹکیا میں بتدریج کمی شروع ہوئی پھر وہ ایک رات کے لئے غائب ہو گیا۔ دانشمند جانتے تھے کہ چاند رات بھر زمین کے نیچے محوِ سفر رہے گا اور پھر اگلی شام سفر کی تھکن سے نڈھال نظر آ جائے گا لیکن اس مرتبہ چاند کو ٹھوکر لگ گئی وہ زخمی ہو گیا کسی دیو پلید نے اسے پابند کر دیا یا متعدد دھانوں اور زبانوں والی عفریت اسے ہڑپ کر گئی؟ وہ اگلی شام اُفق پر نہ تھا۔ اس سے اگلی شام اور پھر اس سے اگلی شام بھی.....

یا مظہر العجائب......!

چاند کے بغیر آسمان کیسا بھیانک لگتا اور وہ ستارے جو جگنوؤں کی مانند چشمک زنی کرتے تھے اب ان کی طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھنے کو بھی جی نہ چاہتا۔ وہ محبت بھرے دل جو سر جوڑے چکور بنے چاند کو تکتے نہ تھکتے اب خوفزدہ' گھر سے باہر نہ نکلتے مبادا سیاہ رات ڈس لے۔ چاندنی رات میں بستی کے بچے گلیوں میں اور سانپ ریت کے ٹیلوں پر کھیلتے تھے مگر اب یہ کھیل موقوف ہو گئے۔ تاریکی نے یوں ہجوم کیا کہ رات کی رانی مہکنا بھولی' مغنی

سُر اور چتر کا رنگ

یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے؟

لوگ ایک دوسرے سے پوچھتے مگر کسی کے پاس معقول جواب نہ تھا۔ یہ الگ بات کہ ہر شخص کے پاس دوسروں کو مطمئن کرنے کے لئے کوئی نہ کوئی وجہ موجود تھی۔ ایسی دلیل جو خود اسے قائل نہ کرتی۔ رات بھر جاگتے رہتے۔ انجانے خدشات کے خلاف پہرے دیتے۔ آسمان کو تکتے۔ ان کی دہشت میں اس وقت مزید اضافہ ہو گیا جب مسافروں سے یہ معلوم ہوا کہ دوسری بستیوں میں تو ایسا اندھیرا نہیں۔

ابھی ان کا خوف کم نہ ہوا تھا کہ ایک رات ستارے ٹوٹنے لگے۔ آسمان موتیوں بھرا تھال تھا گھور اندھیرے میں ستاروں کا دودھیا پن تھا مگر چاند کے بغیر یہ بھی تاریکی کی پرچھائیں نظر آتا تھا اور پھر آسمان کو گھورنے والی آنکھوں نے ایک ستارہ ٹوٹتا دیکھا...... ستارے ٹوٹتے رہتے ہیں یہ خلافِ معمول نہ تھا۔ خلافِ معمول یہ ہوا کہ اس کے بعد ایک اور ستارہ ٹوٹا' ایک اور' پھر ایک اور' اور پھر ایک اور...... یوں محسوس ہوتا گویا تاریکی کی مخلوق مشعلوں سے رقص کر رہی ہو اور ایک ایک کر کے وہ مشعلیں زمین کے باسیوں کی طرف پھینک رہی ہو جو ایک طویل روشن لکیر بنانے کے بعد افق کی تاریکی میں ڈوب جاتیں۔ عورتوں کی چیخیں نکل گئیں' مرد منہ کے بل زمین پر گر پڑے' ماؤں نے بچوں کو گود میں چھپا لیا' بیویوں نے چادروں میں منہ ڈھانپ لئے' کنواریوں کو مقفل کر دیا گیا کہ جہنمی مخلوق کے آتشیں حملہ سے خود کو محفوظ رکھ سکیں۔ ہر ٹوٹنے والا ستارہ اپنے ہی گھر کی چھت پر گرتا محسوس ہو رہا تھا۔

ستارے رات بھر ٹوٹتے رہے اور اس دہشت بھری رات کے اختتام پر جب اگلی صبح جانے پہچانے دوست کی مانند سورج محبت بھری روشنی لے کر آیا تو عافیت کا احساس ہوا۔ ہر شخص دوسرے کی پھٹی پھٹی آنکھوں کے آئینے میں اپنی دہشت دیکھ رہا تھا۔ ہر چہرے پر خوف کی تحریر اور پیشانی پر وحشت کا کتبہ!

رات بھر ٹوٹتے ستاروں کی یلغار میں بستی نہ جلی تو یہ معجزہ تھا اور وفورِ دہشت سے کوئی وحشی نہ بنا تو یہ کرشمہ تھا۔ اب انہیں یقین ہو گیا کہ وہ کسی اجتماعی کابوس میں شریک

ہیں......وہ کابوس جس کا اور چھور نہیں...... ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں!

آسمان کی نیلمیں چمک سکون آور تھی' سورج کی تمازت میں تحفظ تھا' دھوپ تھپکنے والا مہربان ہاتھ......لیکن اس کے باوجود سکون' تحفظ اور مہربانی کا احساس معدوم ہو چکا تھا کہ رات کی حقیقت دن کے اُجالے میں اور بھی بھیانک محسوس ہوتی اور دن کی یاد رات کی تاریکی میں مردہ سپنا محسوس ہوتی اور ان سب پر مستزاد یہ احساس......خواب تھا یا خیال تھا کیا تھا!

وہ اختر شناس کے پاس پہنچے تو اسے گھر کے باہر دونوں ہاتھوں سے سر تھامے پایا۔ استفسار سے پہلے ہی بول اٹھا'

''بھائیو! میں کچھ نہیں سمجھ پایا''

اس کے پاس اس کا علم اوراق کی صورت میں منتشر تھا اور آلات اوندھے جام کی مانند......اس نے مجمع پر نگاہ دوڑائی جو اس کے سامنے قاش کی مانند تھا۔

''میرا علم دم دے گیا'' اس نے سسکی بھری اور سر جھکا لیا اور جسم میں لرزش کی لہر دوڑ گئی۔

وہ ساحر کے پاس پہنچے تو اسے دائرہ میں محفوظ پایا' انہیں دیکھ کر زور سے چلایا'

''دائرے کے اندر مت آنا'' جھجک کر دائرے کے باہر رُک گئے۔

ساحر نے ان سب کی خود پر مرکوز آنکھوں میں جھانکا۔ بولنے کو منہ کھولا مگر ہونٹ کپکپا کر رہ گئے' پیشانی تر ہو گئی۔ وہ دیر تک منتظر کھڑے رہے مگر جب اسے دہشت کا مزار پایا تو سر جھکا کر چلے آئے۔

معبد پہنچے تو ناصح کو سر بسجود پایا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ اس نے ویران ویران آنکھوں سے دیکھا اور تاسف سے سر ہلا کر بولا۔

''شب بھر مقدس تحریروں کا مطالعہ کرتا رہا ہوں مگر کسی میں بھی ایسی آفت کا حوالہ نہ ملا۔ نافرمانوں پر عذاب آتے رہے ہیں مگر ایسے عذاب کا نہ سُنا......''

''...... تو؟''

''بالیقین یہ عذابِ عظیم کی تنبیہ ہے۔''

لوگ خوفزدہ ہو کر چند قدم پیچھے ہٹ گئے۔ وہ دوبارہ سجدہ میں گرنے سے پہلے انہیں نصیحت کرنا نہ بھولا ''تائب ہو جاؤ' عفو مانگو۔''

مرد و زن پیر و جواں سبھی ہجوم در ہجوم حاکم کے محل کی جانب بڑھ رہے تھے۔ سیاہ سروں کی لہریں محل کی جانب رواں تھیں جو بے قراری کے موجیں مارتے سمندر میں عافیت کا جزیرہ تھا۔ محل کے دریچے بند تھے اور در مقفل! دربانوں نے بتایا حاکم پڑوسی حاکم کے پاس جا چکا ہے۔

(2)

وہ پیدا ہوا تو اگرچہ عام بچوں ہی کی مانند تھا مگر اس کے جسم سے بو آتی تھی۔ دایہ نے اسے گود میں لے کر چاند سا مکھڑا دیکھا تو کھل اُٹھی مگر پیار سے منہ چومنا چاہا تو عجب نامانوس بو نے ایسا کرنے سے باز رکھا۔ اس کا کام بچے پیدا کرنا تھا اسے ان کی بو اور خوشبو سے کیا لینا؟ بچہ جانے اور اس کے والدین' وہ چپ رہی۔

ماں نے پہلی مرتبہ سینے سے لگا کر دودھ پلانا چاہا تو اسے بھی نامانوس سی بو محسوس ہوئی۔ بڑی منتوں مرادوں کے بعد یہ بیٹا پیدا ہوا تھا اور وہ بھی بدبودار......یقیناً یہ بدقسمتی تھی مگر تھا تو اسی کا بیٹا' ممتا کی ماری نے دودھ پلایا مگر ناک کی بجائے منہ سے سانس لے کر......دودھ پلانے سے جہاں مامتا سرشار تھی' وہاں ماں کو ناگواری کا احساس بھی ہو رہا تھا۔ وہ چپ رہی۔

باپ نے نہال ہو کر اُٹھایا تو اسے بھی نامانوس سی بو کا احساس ہوا۔ یہ کیسا بدبودار بیٹا جنم دیا ہے میری عورت نے؟ اس نے پریشانی آمیز حیرت سے سوچا۔ شادی کے اتنے عرصہ بعد نسل چلانے والا پیدا ہوا تو وہ بھی بدبودار......تو اب کیا میں بدبودار نسل کا جد کہلاؤں گا؟ ایک لمحہ کو ذہن میں شک کا کانٹا چبھا۔ کہیں یہ عورت بے وفا تو نہیں یا پھر بیٹا لینے کو کسی اور کے بستر پر دستک دے دی ہو' مگر نہیں! یقیناً اس کی عفت کی قسم کھائی جا سکتی تھی اور پھر ساری بستی میں کوئی بھی ایسا بدبودار مرد نہ تھا کہ اس کا تخم بھی بدبودار ہی ہو......یقیناً یہ کوئی مرض ہے جو علاج سے ٹھیک ہو جائے گا۔ یہ سوچ کر وہ مطمئن ہوا۔ ویسے بھی اولاد تھی اور بدبو کے باعث اسے کوڑے کے ڈھیر پر تو نہیں پھینکا جا سکتا تھا۔ اس نے پیار کیا اور چپ رہا!

لاریب کہ بدبودار بچہ عجیب الخلقت بھی تھا!

کھیلنے کو چاند مانگتا۔ ستاروں کو اشارے کرتا اور پھولوں سے گھر بھر لیتا۔ خیر یہ بھی

کوئی ایسی خاص بات نہ تھی کہ بچے ناداں ہی تو ہوتے ہیں مگر ایک دن دیکھا گیا کہ وہ پھولوں سے باتیں کر رہا ہے۔ یہ خود کلامی نہیں بلکہ مکالمہ تھا۔ کیونکہ بات کرنے کے بعد وہ کان لگا کر ہل ہل کر' جواب دینے والے پھول کا جواب بھی سنتا تھا۔ اس دن تو سب حیران رہ گئے جب دیکھا کہ اس کے کندھے پر بیٹھی بلبل اسے حکایتِ گل سُنا رہی ہے۔

ایک دن اس نے ہوا میں مٹھی لہرائی اور پھر بند کر لی۔

''کیا کر رہے ہو؟''

''ہوا کو دیکھ رہا ہوں''

''کہاں ہے ہوا؟''

''میری مٹھی میں۔''

''کیسی ہے ہوا؟''

''دھنک رنگ آنچل جیسی''

اب اگر لوگوں نے اسے مریض' احمق' سڑی یا جنونی جانا تو یہ غلط نہ تھا۔ وہ صورت کا بُرا نہ تھا مگر بدبو اور آن مجنونانہ حرکات کی وجہ سے کسی دوشیزہ نے اسے نگاہِ التفات سے نہ دیکھا تھا' نہ کوئی دوست' نہ سنگی' نہ ساتھی' نہ راز دار' نہ غم خوار' نہ دردمند' نہ ہم درد...... بدبو کیا کم تھی کہ اس کے اطوار اسے ناقابل فہم اور پُراسرار بنا رہے تھے۔ شاید اس پر کسی آسمانی مخلوق کا سایہ تھا۔ یوں وہ بے ضرر تھا' اس میں جنونیوں والی وحشت نہ تھی' دیوانوں جیسی شدت نہ تھی حتیٰ کہ عام افراد جیسی کاروباری ذکاوت بھی نہ تھی۔

بچپن' لڑکپن اور جوانی تنہائی کے زنداں میں کٹی' ایسا زنداں جس کی تشکیل بدبو نے کی تھی۔ رفیق ناآشنا' اپنی بدبو کی زنجیر سے بندھا۔

والدین نے طبیبوں سے علاج کرایا' کاہنوں سے ٹونے اور بزرگوں سے دم' ساحر نے گلے میں نقش باندھا اور جادوگرنی نے سانپ' چھپکلیوں اور کچھوے کا شوربہ پلایا...... سب بے سود! کوئی بھی اس عجیب و غریب اور ناقابل برداشت بدبو کی رمز کو نہ پاسکا۔ یوں اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا گیا...... بے کار' بے یار...... اور یوں وہ اپنی بدبو کے زنداں میں مقید ہو کر رہ گیا۔ اپنی بدبو سے کلام کرتا' خود سے ہم کلام!

ہوا اس کی محبوبہ تھی' شجر دوست' آبشار ساتھی اور جھرنے سنگی! بلاشبہ وہ کسی مافوق الفطرت مخلوق کے زیر اثر تھا۔ اس لئے وہ اپنے اسلوب میں اتنا غیر معمولی اور ان کے معمولات سے جداگانہ تھا۔

اس کی بدبو اب تعفن میں تبدیل ہو چکی تھی۔

(3)

ایک اور عجیب بات ہو گئی۔

وہ بڑا پُرجوش نظر آ رہا تھا۔ وہ چوراہے پر کھڑا چیخ چیخ کر سب کو بلا رہا تھا۔ اگرچہ تعفن کی وجہ سے اب کوئی اس کے پاس نہ کھڑا ہو سکتا تھا مگر اس کا جوش دیکھ کر سب جمع ہو گئے۔

تب اس نے انہیں ایک گیت سنایا۔

یہ کیا کہہ رہا ہے' الفاظ جانے پہچانے مگر مفہوم میں عجب ندرت...... کنواریوں کو اس میں اپنی دھڑکنوں کی بازگشت سنائی دی' حرماں نصیب عاشق کو اپنی نامرادی کا مرثیہ لگا' خردمند کو اس میں ماضی کی دانائی کی گونج سنائی دی' جوان کو اٹھتی جوانی کی انگڑائی لگی تو غریب الوطن کو کھوئے سفر کی کتھا۔ یہ گیت نہیں بلکہ آئینہ تھا!

تعفن کے باوجود وہ داد دینے پر مجبور تھے۔

پہلے گیت کے بعد اس نے مزید گیت بھی سنائے۔ آج تک بستی میں ایسا عجیب و غریب شخص پیدا نہ ہوا تھا۔ جو اتنا بدبودار ہو اور ایسے خوبصورت گیت لکھتا ہو۔ بستی والے عجب مخمصے میں تھے۔ گیت اپنی طرف کھینچتے مگر تعفن پاس پھٹکنے نہ دیتا اور تعفن؟ الامان! تعفن کا تو یہ عالم ہو چکا تھا کہ ہر گھر اس سے معمور ہو چکا تھا۔ یوں محسوس ہوتا گویا کسی عفریت کی صورت میں تعفن فضا پر حاوی ہو گیا ہو۔ گھر' گلی' کھیت' کھلیان' بیوی' بچے حتیٰ کہ اب تو خود سے بھی بدبو آنے لگی تھی' سانس لینی دشوار' اپنا وجود ناگوار' معمر بزرگ' خردمند سر جوڑ کر بیٹھے۔ کیا کیا جائے؟ تعفن سے کیسے چھٹکارا پائیں؟ سوچ بچار اور بحث و تکرار کے بعد متفقہ طور پر یہ طے پایا کہ اسے بستی کی حد سے باہر پہاڑ کے غار میں محبوس کر دیا جائے۔ بچ گیا تو مقدر' مر گیا تو مقدر...... یہ طے تھا کہ اب تعفن مزید برداشت نہیں ہو سکتا۔

بستی کے آخری کھیت کی شادابی ختم ہوتے ہی جنگل شروع ہو جاتا تھا' ایسا

وحشت ناک کہ بیلیں ناگنوں کی مانند شوکتیں، درختوں پر چھل پائیوں کا بسیرا تھا اور رات کو اگیا بتیال چھلاؤں کے ساتھ کھیلا کرتے۔ بجلی سے جلے درخت مردے کے پنجوں کی مانند بے برگ و بار تھے۔

اس جنگل کے خاتمے کے بعد وہ سیاہ پہاڑ نظر آتا جس کی عمودی چٹانوں میں وہ غار روپوش تھا جس کے بارے میں یہ مشہور تھا کہ اس میں خون آشام چمگادڑیں بسیرا کرتی ہیں جب کہ سوراخوں میں سانپ!

وہ بڑے سکون سے چل رہا تھا اور خاصا فاصلہ چھوڑ کر ناکوں پر رومال رکھے وہ اس کے پیچھے تھے...... سب سے آخر میں والدین جورونے کے باوجود اجتماعی فیصلہ تسلیم کرنے پر مجبور تھے۔ جب وہ اسے لینے آئے تو اس نے کسی طرح کی مزاحمت یا ہراس کا مظاہرہ نہ کیا۔ گویا یہ سب اس کے اندازے کے مطابق ہی ہو رہا تھا' بلکہ وہ تو اچھا خاصا مسرور لگ رہا تھا کہ اس کی گنگناہٹ کی آواز ان تک پہنچ رہی تھی۔ وہ غار کے دہانے پر پہنچ کر رُکا' ہاتھ سے سب کو قریب آنے کا اشارہ کیا اور پھر جو اس نے من موہنا گیت سنایا اس میں ان کے لئے..... عفو کا پیغام تھا۔

(4)

غار کا دہانہ پتھروں سے پاٹا جا چکا تھا مگر درزوں سے کرنیں اندر آ رہی تھیں۔ جن کے مدہم اجالے میں غار کا منظر خاصا واضح تھا۔ چھت پر الٹی لٹکی چمگادڑوں اور سانپوں اور بچھوؤں' کسی نے بھی اسے کچھ نہ کہا۔

اسے عجب سا احساس ہو رہا تھا گویا تمام جسم میں غیر مرئی لہروں کا تموج ہو۔ یہ عجب توانائی تھی جو اسے کچھ کرنے پر اُکسا رہی تھی۔ یوں محسوس ہو رہا تھا گویا جسم پتے کی مانند طوفان کی زد میں ہو۔

اس نے انگلی سے غار کی دیوار پر مستطیل کا نشان بنایا اور جب اسے دریچہ کی مانند وا کیا تو فرحت بخش ہوا کے سرد جھونکوں سے غار بھر گیا۔ وہ باہر کے منظر سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ جھومتے درختوں اور تالیاں بجاتے پتوں کو دیکھتا رہا۔ اس نے برق سوختہ شجر کا نوحہ سنا اور پھل کے بغیر بیل کی بپتا' اس نے خود کو ہوا کی مانند سب کا ساتھی محسوس کیا۔ وہ ہوا بھی تھا'

اس سے جھومتا شجر بھی اور ہلتے پتے بھی!

وہ تن شجر کو گیتوں کے بوجھ سے جھکا محسوس کر رہا تھا۔

یہ دریچہ بند کر کے اس نے ایک بڑی کھڑکی بنائی جس کے پٹ کھلنے پر سمندر کی موجوں کا خروش دکھائی دیا۔ نمکین ہوا بال اڑا رہی تھی۔ آبی پرندے اڑان کے دائرے اور قوسیں بنا رہے تھے وہ ساحل پر ٹکراتی موجوں کے جھاگ کی سفیدی میں پہاڑوں کی برف کی سفیدی دیکھ رہا تھا۔ نیلا سمندر جب قطرے کے موتی میں تبدیل ہو کر ساحل پر ٹوٹتا تو اس میں رنگوں کی جوالا کی تپش محسوس کر سکتا تھا۔ دور اُفق پر سمندر کے نیلمیں سینے میں سورج کا جھومر اتر رہا تھا۔ سمندر پگھلا سونا بن چکا تھا جس میں اڑتے سفید پرندے چاندی کی زیور جیسے تھے۔ اس نے دونوں بازو پھیلا دیئے گویا سمندر کو بلاوا دے رہا ہو اور پُرشور گرج سے سمندر بھی اس کا خیر مقدم کر رہا تھا۔

(5)

نہ چاند طلوع ہوا' نہ ستارے ٹوٹے بند ہوئے' سب دل ہراس کی مٹھی میں' اب تک کوئی آفت نہ آئی اور وہ سب زندہ تھے تو یہ بھی معجزہ تھا۔

جب سب دروازے کھٹکھٹا لئے تو انہیں پیر دانش مند یاد آیا جو اپنی دانش کے تحفظ کی خاطر خود ہی بستی تج کر چلا گیا تھا۔

جب سب نے اس سال خوردہ کے پاؤں پکڑ لئے اور رو رو کر بستی کی بپتا سنائی تو وہ خاموش بیٹھا رہ گیا۔

''بابا! کچھ تو بولو''

''تم نے کسی کے ساتھ ظلم کیا ہے۔''

''ہم نے......؟'' ہر شخص خود کو معصوم سمجھتا تھا۔

''یہ اس کی سزا ہے۔''

ہر شخص سے چھوٹی موٹی باتیں سرزد ہو جاتی ہیں مگر اتنا بڑا گناہ یا گھناؤنا جرم تو کسی نے بھی نہ کیا تھا کہ یوں ہدف عقوبت بنتا۔

سب سوچ رہے تھے۔ میں نے اس کا بیل چرایا' میں نے اس کی بیوی کو ورغلایا'

میں نے اس کی رقم ماری' میں نے کمزور کو پیٹا' میں نے والدین کی نافرمانی کی' میں نے رقیب کا بُرا چاہا...... مگر یہ اتنے بڑے گناہ تو نہ تھے کہ بستی پر ایسا عذاب نازل ہوتا۔

سب سر جھکائے بیٹھے تھے۔

"تم اتنے معصوم نہیں ہو...... سوچو!"

تب بیک وقت سب کو وہ بدبودار شخص یاد آیا جسے انہوں نے چمگادڑوں اور سانپوں والے غار میں مرنے کو بند کر دیا تھا۔ یہ اجتماعی جرم تھا جس کی اجتماعی سزا پا رہے تھے۔ تعفن کے علاوہ اس کا اور کوئی قصور بھی تو نہ تھا' تو اب......؟

"جاؤ! اور جا کر اسے واپس لاؤ۔"

"واپس لائیں؟"

"اس نے تمہارا بُرا چاہا تھا؟"

"نہیں"

"کسی کے ساتھ دغا کی؟"

"نہیں"

"تو پھر......؟"

"مگر اس کا تعفن!"

"تعفن سے گزارا کرنا سیکھو اس کے گیتوں کی خاطر۔"

......سب نے سرِ تسلیم خم کیا۔

(6)

آج وہ پھر اسی جنگل سے گزر کر غار کے سامنے جمع تھے۔ سب مل کر غار کے منہ سے پتھر ہٹاتے ہیں' کچھ دیر تک وہ جھجکے سے باہر کھڑے رہتے ہیں۔ اس کے بعد چند جری ہمت کر کے اندر داخل ہوئے اور مانندِ تصویر حیرت زدہ رہ گئے۔

خالی غار کی دیواروں پر ستاروں جیسے دمکتے الفاظ میں گیت لکھے تھے اور لفظوں کی خوشبو چاندنی بن کر غار میں اُجالا کئے تھی۔

O.....O.....O

لکھا بادِ سموم نے!

ریگستان کی کروٹیں لیتی ہوا سے بنتی بگڑتی ٹوٹتی سنورتی ریت لہروں کا جال تا حدِ نگاہ۔ شاید ان ریت لہروں میں ریت مچھلیاں بھی ہوں مگر ریت سمندر کی تہہ میں غوطہ کون لگائے؟ ہاں! ریت کا ذرہ یہ کام کر سکتا تھا۔ اُفق کے مکمل ترین دائرہ کے مدور خط کے تسلسل کو توڑنے والی اور کوئی شے نہ تھی۔ بادل کی موج سے خالی آسمان نیلا شانت سمندر پردار سے خالی نیلیں فضا اُجلی اور نکھری نکھری' ہوا کی کروٹوں سے بے چین ریت سمندر' ہوا کی کروٹوں سے بلند آسمان کا اتھاہ سمندر' ریت کے دائرہ میں ریت کے علاوہ اور کچھ بھی نہ تھا۔ نہ نخل نہ نخلستان' نہ آہو نہ رمِ آہو...... اور اس دائرہ کے مرکز میں نقطہ موہوم! ایک مرد!

مرد چار کھونٹ پھیلا ریت سمندر دیکھتا ہے تو آنکھوں میں گویا ریت اُتر جاتی ہے۔ وہ خود کو مکمل ترین طور پر تنہا پاتا ہے اور یُوں سب سے الگ خود کو تنہا پا کر اطمینان کی گہری سانس لیتا ہے۔ وہ کہ مردم گزیدہ تھا اس لئے اب انسانوں کے جنگل' اس جنگل کے شور اور بے معنی بھاگ دوڑ سے خود کو دور اس بے حرکت ماحول میں تنہا پا کر بے حد مسرور ہے۔ وہ خود کو ریت ذرہ سمجھتے ہوئے ریگستان کی دھڑکن اور اپنے دل کو ایک ہی تال پر محسوس کرتا ہے۔ خوشی کے عالم میں دونوں بازو پھیلاتا ہے تو اُنہیں اُفق کو چھوتا محسوس کرتا ہے۔

ایک مرتبہ پھر نظریں گھما کر اطراف کا جائزہ لیتا ہے' خود کو ہر لحاظ سے تنہا پاتا ہے۔ یہاں کوئی نہیں' صرف ریت ساتھی ہے۔ یہاں کوئی دوست نہیں' صرف ہوا دوست ہے۔ یہاں کوئی دشمن نہیں' بجز اپنے وجود کے!

......کیا واقعی وہ اپنا دشمن تھا؟

مگر ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ وہ بھلا خود اپنا دشمن کیسے بن سکتا تھا؟

اور پھر انسان اپنا دشمن کیسے ہو سکتا ہے؟ حتیٰ کہ وہ لوگ بھی اپنے دشمن نہیں ہوتے جو خودکشی کر لیتے ہیں شاید خودکشی اپنے ساتھ آخری دوستانہ فعل ہوتی ہے! مگر وہ تو خودکشی بھی نہیں کر رہا تھا۔ ہاں یہ سمجھتا تھا کہ بستی اجتماعی خودکشی کر رہی ہے‘ وہ انہیں منع کرتا تھا اور اسی لئے مردود سمجھا جاتا تھا مگر وہ مسلسل انہیں اس راستے پر آنکھیں بند کر کے چلنے سے منع کرتا تھا جو اس کی دانست میں سب کو ہلاکت کے گڑھے میں گرانے والا تھا۔ مگر بستی والے اندھے ہی نہیں بلکہ گونگے اور بہرے بھی بن چکے تھے۔ ہاں ان کی زبانیں لمبی تھیں‘ لمبی بے حد لمبی اور ساتھ ہی نوکیلی اور تیز دھار والی بھی۔ وہ ان زبانوں سے تیز دھار والے ہتھیاروں جیسے کام لیتے تھے بلکہ اسی فن کے ماہر تھے مگر اس کا المیہ یہ تھا کہ وہ ان میں سے ہوتے ہوئے بھی ان سے الگ تھا‘ اس لئے اس کی زبان وہ سب کچھ کرنے سے قاصر تھی جو بستی والوں کی زبانیں کرتی تھیں اور اس کے ساتھ یہ بھی کہ اس کی آنکھیں وہ کام کرتی تھیں جو بستی والوں کی آنکھوں نہ کر سکتی تھیں۔ اس کے کان وہ کام کرتے تھے جو بستی والوں کے کان نہ کر سکتے تھے یعنی آنکھیں واقعی دیکھتی تھیں اور کان واقعی سُنتے تھے اس لئے ذہن سوچتا تھا اور یہی باعثِ فساد تھا۔

وہ تو سب کا دوست تھا مگر بستی دشمنوں میں تبدیل ہو گئی اور جب ان سب کی قوتِ برداشت جواب دے گئی تو انہوں نے اسے بستی سے نکال باہر کیا۔ ریت سمندر میں‘ پیاس سمندر میں ڈوب مرنے کو تنہا چھوڑ دیا۔ بالکل تنہا‘ بن پتوار کی نیا کی مانند۔ شریکِ زندگی نے بستی کی حد تک بھی ساتھ نہ دیا‘ بیٹے اچانک بے حد مصروف ہو گئے اور بیٹیاں خاوندوں کے گھروں سے نہ نکل سکیں۔ رہے دوست تو ان سے یُوں بھی کوئی توقع نہ تھی کہ وہ تو ہوتے ہی منافق ہیں لہٰذا سب سے پہلے وہی دشمن بنے تھے۔ جب وہ بستی سے نکلا تو گالیاں‘ پتھر اور کُتے رخصت کرنے آئے تھے۔ ہجوم در ہجوم!

وہ مطمئن تھا اور یہ ایسا گہرا اطمینان تھا جو نشہ بن کر اعصاب کو مدہوش کر دیتا ہے۔ بستی میں انسانوں کے جنگل میں خود کو کبھی بھی مطمئن محسوس نہ کیا تھا۔ باہر ہوتا تو دوستوں کی

منافقت کو سانپوں کی مانند آستین میں پلتے محسوس کرتا‘ گھر جاتا تو بیوی کے خود غرضانہ جسم کی کاذب راحت کے عذاب میں جلتا مگر اب ان سب سے دُور...... وہ بے حد خوش تھا‘ بے حد مطمئن اور بے حد آسودہ!

اس نے مٹھی بھر ریت اُٹھائی اور اسے دوسرے ہاتھ کی مٹھی میں گرانے لگا‘ ریت سے بھری ایک پیالی سے دوسری خالی پیالی میں ریت ذرہ ذرہ گر رہی تھی یوں کہ گرتے ذرے اور گزرتے لمحات یکجان ہو گئے۔ اُوپر___ بہت اوپر اور بہت دُور کسی غیر مرئی پیالے کے نیچے خالی پیالے میں گریزپا لمحات ریت کے ذرات کی مانند ایک ایک کر کے گر رہے تھے۔ تب اچانک یہ پیالی اور وہ پیالہ جیسے ایک ہو گئے۔ ہاتھ‘ پیالہ‘ ذرہ اور لمحہ سب ایک ہو گئے۔ یک جان! دھڑکن کی بازگشت میں دھڑکن اور پھر اس دھڑکن کی بازگشت میں دھڑکن اور پھر......

سامنے اُفق پر دُھند کا پردہ تن رہا تھا۔ آہستہ آہستہ ریت کے ذرات کے گرنے کی رفتار سے ہم آہنگ‘ صاف اور اُجلا پردہ‘ ہوا کی سلوٹوں سے آزاد‘ اپنے وجود میں مکمل‘ پردے کا پھیلاؤ‘ اُفق تا اُفق‘ بے کراں۔

......اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں!

یا مظہر العجائب! یہ کیا دیکھ رہا ہوں میں‘ پردے پر آہستہ آہستہ شبیہیں اُبھر رہی تھیں‘ غیر مرئی غیر محسوس کُن طور پر آہستہ آہستہ‘ پہلے منور ذرات نظر آئے گویا سطحِ آب پر ستاروں کا عکس یا شبنم کی جھلملاہٹ‘ یہ منور ذرات گردش کُناں تھے‘ ہلکی گردش‘ تیز گردش‘ قوسیں نیم دائروں میں تبدیل ہو رہی تھی اور نیم دائرے مکمل دائروں میں ڈھل رہے تھے۔

یہ پلک جھپکنے کا منظر تھا کہ صدیوں کی انگڑائی تھی؟ وہ کچھ نہ سمجھ پایا۔

اگلے لمحہ بستی کی تصویر دُھند کے بے شکن پردے پر منعکس ہوتی نظر آئی۔ وہ پلکیں تک جھپکنی بُھول چکا تھا‘ سانس آ رہی تھی کہ رُکی ہوئی‘ اسے قطعاً احساس نہ تھا۔ یقیناً یہ بستی ہی تھی اگرچہ بہت چھوٹی سی‘ مگر پھر بھی مکمل ترین حالت میں‘ وہ بعض اہم مقامات اور مشہور بازاروں تک کو پہچان سکتا تھا۔ زندگی کے معمولات سے پُر یہ بستی واقعی اسی کی بستی تھی۔ کاروبار ہو رہا تھا‘ بچے کھیل رہے تھے‘ باغوں میں ہجوم تھا اور تفریح گاہیں لوگوں سے پُر‘ اس

نے ذہن پر زیادہ زور دیا تو بعض گلیاں بھی پہچان لیں اس نے کوشش کی کہ اپنا کوچہ یا مکان دیکھ پائے مگر ایسا نہ ہو سکا۔ اسے یہ دیکھ کر کوئی تعجب نہ ہوا کہ اس کے بغیر بستی' زندگی اور ہنسی سے بھرپور تھی بلکہ شاید اس کے بغیر زیادہ ہی خوش تھی۔

......اور پھر اچانک!

اگرچہ ریت سمندر کی موجیں سورج میں جھلملاتی لہروں کا منظر پیش کر رہی تھی مگر بستی میں تاریکی کا سورج طلوع ہو رہا تھا۔ تاریکی گویا لمبے لمبے ہاتھوں سے تمام مناظر کو اپنی سیاہ جھولی میں ڈالتی جا رہی تھی' کوچہ و بازار کی روشنیاں تاریکی کے سیلاب میں نیم جان چراغوں کی مانند گم ہوتی جا رہی تھیں۔ لوگ اس تاریکی کا مقابلہ کرنے کے لئے مصنوعی روشنیوں سے کام لے رہے تھے جو ایک آدھ مرتبہ جگنو کی طرح چمک کر دم توڑ دیتیں......اور پھر تعجب پر تعجب!

بستی اُلٹی ہو گئی' ہاں! اب سب کچھ اُلٹا تھا' قیام گاہیں' تفریح گاہیں' راحت گاہیں' عشرت گاہیں......سب اُلٹی! مرد' عورت' بچے اور ڈھور ڈنگر سب اُلٹے۔ موت کے خوف سے بھاگتے' چیختے چلاتے' پناہ گاہوں کی تلاش میں سرگرداں' مگر جدھر جاتے اندھیرے کا لاوا ان کے پیچھے ہوتا' جدھر جاتے اندھیرے کے غاروں کو منہ کھولے منتظر پاتے اور پھر وہ سب ریت کے ذرّوں کی مانند گرتے گئے۔ ٹپ! ٹپ! ٹپ! ٹپ! گویا ریت بادل کی بوندیں ریت سمندر میں گر رہی ہوں۔

اس نے رُکی ہوئی طویل سانس چھوڑی تو پھیپھڑوں میں درد کی اَنی محسوس کی' پلکیں جھپکا کر سامنے دیکھا مگر وہاں تو کچھ بھی نہ تھا۔ خاموش فضا' نکھرا آسمان اور اُفق تا اُفق پھیلی ریت......ابھی تک ہاتھ کی ریت بھری پیالی سے ریت کے ذرے نیچے ہاتھ کی خالی پیالی میں گر رہے تھے۔

O.....O.....O

مٹی کا قرض

زرد گھاس کی ملگجی چادر پر جسم چند سلوٹوں کی صورت میں باقی رہ گیا تھا وہ جسم کہ زندگی کا مرکز بھی تھا اور مدار بھی' لیکن بیماری نے دیمک بن کر تن شجر یوں کھایا کہ کچھ نہ بچا' نہ زن رہی نہ زن ثمر۔ مگر وہ بہادر تھی بیماری سے اس طرح نہ گری جیسے بجلی کے ایک ہی وار سے درخت جل جاتا ہے۔ وہ بیماری کا مقابلہ کرتی رہی لیکن کب تک؟ دیمک اور لکڑی کی لڑائی میں شکست ٹھہری لکڑی کا مقدر۔ بال خشک بیلیں۔ ہاتھ سوکھی ٹہنیاں' جسم کٹا تنا' سانس مردہ پتوں کی کھڑکھڑاہٹ' آنکھیں گدلے پانی کے گڑھے' الغرض! جسم کا چھتنار شادابی گنوا بیٹھا یوں کہ جسم کی آرام سرا بھوت کھنڈر نظر آنے لگی۔

وہ گری تو پھر نہ اُٹھی!

اس نے دل جیسے ویران گردو پیش پر نگاہ دوڑائی مگر وہاں دیکھنے کو کیا تھا؟ وہ زندگی کی دھوپ تھی وہ نہ رہی تو گردو پیش کو بھی ویرانی نے ڈس لیا۔ باہم ملے درختوں کی چھتوں پر مکڑیوں کے جالے لٹک رہے تھے' بیلوں میں چیونٹیاں سراسرا رہی تھیں' چیونٹوں کا پھولوں میں بسیرا تھا اور مردہ گھاس پر تن کا مرجھایا پھول دھرا تھا۔

وہ ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا کہ وہ کیا تھی اور اب کیا نظر آ رہی ہے! تن سا گر سراب میں تبدیل ہو گیا تھا۔

وہ اسے دیکھ کر مسکرا دی' یہ اس کی مسکراہٹ کا خاص انداز تھا' ہونٹ بند مگر آنکھیں مسکراتیں۔ اس نے بھی مسکرانا چاہا مگر ہونٹوں کے کونے کپکپا کر رہ گئے' ٹھوڑی میں

خفیف سی لرزش ہوئی مگر نہ لب مسکرا سکے اور نہ آنکھیں، وہ اب بھی اسی کو دیکھے جا رہا تھا۔

اس مرتبہ وہ مسکرائی تو یہ مسکراہٹ ہونٹوں کی کرن ثابت ہوئی اس نے بھی مسکراہٹ کا ساتھ دینے کی کوشش کی مگر ہونٹوں کے کنارے محض کھنچ کر رہ گئے۔

''کیا ناراض ہو؟''

وہ اس سوال پر حیرت زدہ رہ گیا ''ناراض؟'' اس نے تعجب سے دہرایا۔

''ناراض! ہاں ناراض''

''ناراض؟ مگر کیوں''

''میں جا جو رہی ہوں۔''

وہ کچھ دیر تک خاموش رہا گویا مطلب سمجھنے کی کوشش کر رہا ہو۔ پھر بولا۔ ''تم سدا سے اپنی مرضی کی مالک رہی ہو۔''

''مگر اس کے باوجود تم میرے مالک تھے۔''

''شاید!''

''شاید نہیں، یقیناً!'' وہ زور دے کر بولی۔

وہ زور سے ہنسا۔

''اب کیوں ہنسے؟'' وہ مشکوک انداز میں بولی۔

''اپنی ہر بات منوانے کی عادت اب بھی نہیں گئی۔''

''کیوں اب کیا ہوا ہے؟''

''اب کیا ہوا ہے؟'' اس نے اسی کا فقرہ دہرایا۔ ''کیا تمہیں نہیں پتہ کہ اب کیا ہوا ہے؟''

''کچھ ہوا تو ہے؟'' وہ آہستگی سے بولی ''مگر میں کچھ سمجھ نہیں پا رہی۔''

''پگلی تو مر چکی ہے۔''

''ہائے میں مری'' وہ گھبرا کر بولی ''یہ کیا کہہ رہے ہو؟''

اس نے اسے بھیگی آنکھوں سے دیکھا اور رندھی آواز میں بولا ''میری بھولی' یہ سچ ہے کہ تم مر چکی ہو۔''

''مر چکی؟'' وہ حیرت سے بولی ''مگر مجھے تو کچھ بھی نہیں محسوس ہو رہا ہے۔ میرا مطلب ہے زندگی اور موت کا فرق۔''

''یہ تو میں بھی نہیں جانتا کیوں کہ میں بھی تو ابھی زندہ ہوں لیکن یہ حقیقت ہے کہ تم مر.....''

سسکی نے فقرہ مکمل نہ ہونے دیا۔

وہ خاموشی سے اُسے دیکھتی رہی پھر آہستگی سے بولی۔ ''اس کا مطلب ہوا جدائی؟''

وہ بولا ''جدا تو ہم اب بھی ہیں۔''

''وہ کیسے؟''

''بھئی! تم مر جو چکی ہو!''

''یہ نہ کہو'' وہ تیزی سے بولی۔

''چلو یوں سمجھ لو کہ تم زندہ نہیں ہو۔''

''اور تم؟''

''میں ابھی مرا نہیں۔''

''ہاں!'' وہ اطمینان سے بولی ''یہ بات کچھ سمجھ میں آتی ہے مگر جدائی کیسے؟''

''اس لئے کہ.....''

وہ بات کاٹ کر بولی۔ ''ہم دونوں ساتھ ہیں اور بات چیت بھی ہو رہی ہے۔''

مگر وہ اس کی بات گویا ان سنی کرتے ہوئے بولا ''یہ ساتھ اور گفتگو تو عارضی ہے تھوڑی دیر میں، ہم جدا ہونے پر مجبور کر دیئے جائیں گے۔''

''مگر کیسے......؟''

''تم...... تم...... '' منہ سے بات نہ نکل رہی تھی۔

''ہاں ہاں کہو!''

''تمہیں زمین میں گڑھا کھود کر دبا دیا جائے گا۔''

''نہیں یہ مجھے پسند نہیں!'' وہ قطعی لہجہ میں بولی ''اور پھر مجھے اندھیرے میں ڈر

بھی تو لگتا ہے۔ تمہیں تو پتہ ہے۔''

وہ جذباتی ہو کر بولا ''میری عمر تمہارے ساتھ بسر ہوئی ہے مجھے کیوں نہ پتہ ہوگا لیکن دستور یہی ہے۔''

''مگر جب مجھے گڑھے میں دبایا جانا پسند ہی نہیں تو پھر کیوں؟''

وہ کسی بچے کو سمجھانے کے انداز میں بولا ''اس لئے کہ تم...... مر...... میرا مطلب ہے کہ اب زندہ نہیں ہو۔''

''اور اس کی سزا یہ ملے گی کہ میری مرضی کے بغیر مجھے مٹی میں دبا دیا جائے۔''

وہ سر جھکا کر بولا ''مجبوری ہے۔''

اس نے پوچھا ''اگر یوں نہ ہو تو پھر کیا ہو؟''

وہ نرمی سے بولا ''جلا دیا جاتا ہے' پانی میں بہا دیا جاتا ہے.... چیل کوؤں کو کھلا دیا جاتا ہے۔''

''مگر کیوں؟''

''اس لئے کہ جو زندہ ہیں اور جو زندہ نہیں ہیں وہ اکٹھے نہیں رہ سکتے۔''

''محبت کرنے کے باوجود بھی؟''

'محبت کرنے کے باوجود بھی!''

وہ اب خاموش تھی گویا صورتِ حال کو سمجھنے کی کوشش کر رہی ہو وہ بھی آزردہ سا سر جھکائے بیٹھا تھا۔ پھر وہ نرم لہجہ میں بولا ''دیکھو جسم مٹی سے بنتا ہے اسی لئے مٹی کا قرض ادا کرنا ضروری ہوتا ہے۔''

''مٹی کا قرض؟'' اس نے یوں دھرایا گویا ان الفاظ کا ذائقہ محسوس کر رہی ہو۔

''ہاں!'' وہ پھر نرمی سے بولا ''یوں سمجھو زندگی کا تحفہ ملنے کا نذرانہ یا پھر جسم بسر کرنے کی قیمت۔''

''جسم بسر کرنے کی قیمت؟ یہ آج تم کیسے الفاظ استعمال کر رہے ہو؟''

''ہم آج سے پہلے کبھی ایسی صورتِ حال سے دوچار جو نہ ہوئے تھے اس لئے کبھی بھی ایسے الفاظ کی ضرورت نہ محسوس ہوئی۔''

وہ یوں گویا ہوئی جیسے سب سمجھ چکی ہو ''تو اس کے بغیر چارا نہیں؟ میرا مطلب ہے مٹی کا قرض ادا کئے بغیر اور جسم بسر کرنے کی قیمت دیئے بغیر۔؟''

''نہیں!''

''افسوس!''

دونوں خاموش تھے پھر وہ آزردہ لہجہ میں بولا ''دیکھو! خوش دلی سے یہ سب قبول کرلو۔''

''یعنی گڑھے میں دبایا جانا؟ تمہیں چھوڑنا؟ تم سے محبت نہ کرنا؟ یہ سب خوشی خوشی قبول کرلوں؟''

''مجبوری ہے۔''

''اچھا یہ بتاؤ مٹی میں دب کر کیا ہوگا؟''

''مجھے پتہ نہیں' لیکن سنا ہے مٹی اپنا قرض وصول کرتی ہے۔''

''کیسا قرض؟''

''ہم اس زمین پر چلتے ہیں اسے استعمال کرتے ہیں اس کا قرض۔''

وہ زچ ہو کر بولی ''آج تمہاری کوئی بات بھی پلے نہیں پڑ رہی۔''

''مجھے افسوس ہے'' وہ مزید افسردگی سے بولا مگر وہ سنی ان سنی کرتے ہوئے بولی۔

''حالانکہ اس سے پہلے ہم ایک دوسرے کے دل کی بات سمجھ لیتے تھے۔ زبان نہ ہلتی مگر آنکھیں بولتی تھیں۔''

''اب صورتحال مختلف ہے۔''

وہ مذاق اڑانے والے لہجہ میں بولی۔ ''مجھے معلوم ہے یعنی میں زندہ نہیں' تم مردہ نہیں ہو۔''

وہ خاموش رہا پھر اس نے دھیمے لہجہ میں پوچھا۔ ''گویا یہ بات طے ہے اور میری مرضی کو کوئی دخل نہیں؟''

''تمہاری مرضی کیا خود میری مرضی کو بھی دخل نہیں حالانکہ میں تو زندہ بھی ہوں۔''

''تو پھر یوں کرتے ہیں۔'' وہ اس جوش سے بولی کہ وہ اسے چونک کر دیکھنے پر

مجبور ہو گیا ''ہاں! ہم دونوں اکٹھے چلتے ہیں۔''

اس نے سوالیہ انداز میں دیکھا

''میری بات نہیں سمجھے؟''

اس نے نفی میں سر ہلا دیا وہ اسے سمجھانے کے انداز میں بولی ''مجھے ہر حالت میں مٹی کا قرض ادا کرنا ہے...... ہے نا؟''

''ہاں۔''

''تو پھر کیوں نہ ہم قرض ادا کرنے کی بجائے مٹی کو اور مقروض کر دیں۔''

''اور مقروض کر دیں؟'' وہ حیرت سے بولا ''اب تمہاری بات میرے پلے نہیں پڑ رہی۔''

وہ تحمل سے بولی۔ ''سنو! غور سے سنو! ہم جسم بسر کرنے کی قیمت یوں ادا کرتے ہیں کہ جسم کو مٹی میں دبا دیتے ہیں' ٹھیک......؟''

''ٹھیک!''

''زمین اپنا قرض کیسے وصول کرتی ہے؟''

''شاید ان کیڑوں کے لئے رزق مہیا کر کے جو زمین سے باہر نہیں آ سکتے۔''

''ٹھیک ہے! مگر میں ایسا نہیں کر سکتی ہم جسم کو کیڑوں کی خوراک نہ بننے دیں گے۔''

''کیسے؟''

دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں دونوں کے لبوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ ''ٹھیک ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''تم کہتی ہو تو ٹھیک ہی ہو گا۔''

''کیا اس سے پہلے میں کبھی غلط ثابت ہوئی؟''

''اب کیا کہہ سکتا ہوں۔''

''جنت میں سانپ والی بات سے شروع کرو تو دیکھو گے کہ ہر وہ معاملہ جس میں تم نے میرا کہا مانا اس میں نئے پن کا مزا تھا۔''

''خرابی کے باوجود بھی؟'' اس نے پوچھا۔

''خرابی کے باوجود بھی'' وہ قطعی لہجہ میں بولی ''بلکہ اس خرابی کا بھی اپنا مزا تھا۔''

''تم نے سدا اپنی بات منوائی ہے اور اب بھی تمہاری منشا کے مطابق ہی ہو گا۔''

''یہاں کتنے بیج ہوں گے؟''

''بہت ہیں۔''

''ہر طرح کے پھولوں کے؟''

''ہاں ہر طرح کے پھولوں کے''

''خوبصورت' خوش رنگ' ملائم' معطر' پُر بہار؟''

وہ جیسے اس کے ساتھ دھرا رہا تھا ''خوبصورت' خوش رنگ' ملائم' پُر بہار۔''

''بیجوں سے جیبوں کو منہ تک بھر لینا۔''

''وہ سامنے دیکھ رہے ہو نہ___؟''

''ہاں! کیسی اجڑی زمین ہے نہ گھاس' نہ پھول' نہ پرند''

''ہاں! یہ زمین ہمیشہ سے ہی اسی طرح ویران اور اداس رہی ہے۔''

''مگر اب یہ ایسی نہیں رہے گی یہ پھولوں کا لباس پہنے گی ایسا خوبصورت لباس کہ دور سے پرندے دیکھنے آئیں گے۔''

''اور ہوا میں عطر ہو گا'' وہ بولا۔

''تم گڑھا بڑا بھی کھودنا اور گہرا بھی'' وہ مسکرا کر بولی۔

''ہاں یہ تو کرنا ہی ہو گا۔''

''یوں میرے ساتھ نہ آنے پر بعد میں افسوس تو نہ کرو گے؟''

''پگلی!'' وہ پیار سے بولا ''ہمارا بعد ہمارے آج کے مقابلے میں کہیں بہتر ہو گا۔''

''ہاں کہیں بہتر ہو گا'' اس نے دھرایا' پھر دھیرے سے بولی ''کیا ہم دونوں ایک ہی شاخ کے پھول ہوں گے۔''

''یقیناً'' وہ قطعی لہجہ میں بولا۔

اب جو دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا تو ان کی آنکھوں میں اطمینان کی کلیاں تھیں اور لبوں پر مسکراہٹ کے پھول۔

O.....O.....O

نادیدہ

منتشر سانسوں کی یلغار سے سینہ کی بستی میں ہلچل، ہاتھ پاؤں میں خوف کی کپکپاہٹ، تپ چڑھی حلق میں زبان لرزاں اور پھیلی پتلیوں میں دہشت کی پرچھائیاں ـــــ وہ سروں، بازوؤں، آنکھوں اور زبانوں کے گھیرے میں بے بس جانور کی مانند تھا گویا ابھی گھیرا توڑ بھاگ نکلے گا مگر کیسے بھاگتا کہ یہ گھیرا ہی تو جائے پناہ تھا۔ وہ اپنی بستی میں تھا اور یہ سب جانے پہچانے چہرے تھے سنگی ساتھی بزرگ مہربان اور مشفق۔

مسلسل بولنے والے چپ تھے۔ اس نے جھکا سر اٹھا کر چہروں پر نگاہ دوڑائی تو آنکھوں کے جال میں تجسس، استفسار، رحم، پریشانی، دکھ اور خوف کی مچھلیاں دیکھیں۔ کسی نے آگے بڑھ کر اس کے منہ سے کٹورا لگا دیا۔ ریت بھرے منہ، کانٹوں بھرے حلق اور جلتے سینہ سے پانی کی سرد دھار نے پھڑ پھڑاتے معدہ کو پرسکون کر دیا اور یوں تنے اعصاب شانت ہو گئے، اس نے ہونٹوں پر زبان پھیری اور جھرجھری لے کر بولا۔

"میں نے اسے دیکھا"

"کسے؟"

"اسی کو"

غیر ارادی طور پر مجمع چند قدم پیچھے ہو گیا۔ یہ کیا کہہ رہا ہے، یہ کیسے ہو سکتا ہے ناممکن، پاگل ہو گیا ہے کیا؟ بے وقوف تو نہیں بنا رہا ہمیں؟ ہر شخص کے ذہن میں سوالات تھے۔ سوالات نئے نہ تھے کہ بستی عجب سوالوں کے بھنور میں تھی۔ ایسے سوالات جن کا جواب کسی

کے پاس نہ تھا نہ معمر کے پاس نہ مدبر کے پاس۔ نہ معلم کے پاس نہ منجم کے پاس۔

وہ صبح ہزاروں صبحوں جیسی عام صبح تھی۔ سورج ویسا ہی روشن اور دھوپ ویسی ہی مہربان، ہوا ویسی ہی پرمہک اور مرغزار ویسا ہی خوش منظر جب کہ آسمان ویسا ہی نیلمیں۔ لیکن رات کی تاریکی میں کچھ نہ کچھ ہو گزرا تھا جو اس صبح ہر شخص نے، پڑوسی کو بلکہ ساری بستی ہی کو بدلا پایا۔ یہ تبدیلی کس قسم کی تھی، کسی کو اس کا وقوف نہ تھا لیکن یہ بھی ادراک تھا کہ کچھ ہو رہا ہے یا پھر ہونے کو ہے۔ معمر کا تجربہ سوکھا پھول، مدبر کی تدبیر خالی کٹورا، معلم کی کتاب کرم خوردہ اور منجم کی آنکھ میں کنکر۔ سب ہار گئے، سب بے سود!

بستی میں ابھی تک کسی کو نقصان نہ پہنچا تھا لیکن ہر شخص مشوش تھا کہ کہیں نہ کہیں اس کی بربادی کی تدبیریں ہو رہی ہیں۔ کل بستی ہراساں کہ لاریب کوئی آفت آنے والی ہے۔ نادیدہ خوف کی مٹھی میں جکڑے دلوں کی دھڑکنیں بے قابو! یہ نیک شریف بھولے اور بردبار لوگوں کی بستی تھی مگر اس نادیدہ کی دہشت نے ان پر یوں غلبہ پالیا کہ وہ اسی کے غلام ہو کر رہ گئے۔ اجتماعی خوف کے مقابلہ کے لئے پر اتفاق اجتماعی سعی کے برعکس انہوں نے اپنے وجود، اپنے کنبہ اور اپنے گھر کو جائے پناہ جانا جس کے نتیجہ میں ہر ذہن میں شک کے کانٹوں کی فصل اُگنے لگی۔ ہر شخص دوسرے سے خوف زدہ یوں کہ بستی پر گویا خوف کا بادل چھا گیا ہر شخص پر تشویش، پراندیشہ اور پروہم۔ پڑوسیوں نے دیواریں اونچی کر لیں، دوست بغل گیر ہونے سے کترانے لگے، خورد بزرگوں کے دستِ شفقت سے گریزاں، شوہروں کو بیویوں کی وفاداری ڈھونگ معلوم ہونے لگی اور دوشیزاؤں کی پرحجاب نظروں میں ترغیب کے سانپ لہراتے دکھائی دینے لگے۔ الغرض! خوف اور اس کے پیدا کردہ شک، وہم اور بداعتمادی نے فضا میں یوں زہر گھولا کہ بستی میں بسر ہونے والی پراطمینان زندگی خواب پریشاں میں تبدیل ہو گئی۔

اب تک نادیدہ وجود کو کسی نے بھی نہ دیکھا تھا صرف اس کی دہشت محسوس کی جا رہی تھی۔

وہ بتا رہا تھا۔

"میں جنگل میں جا رہا تھا کہ اچانک میں نے محسوس کیا گویا منظر تبدیل ہو گیا"

''کیا مطلب؟''

وہ طویل سانس لے کر بولا ''میں یہ سمجھا نہیں سکتا لیکن مجھے...... مجھے یوں محسوس ہوا گویا میں اچانک کسی اور جنگل میں پہنچ گیا ہوں۔'' اس نے پریشان ہو کر بالوں میں ہاتھ پھیرا اور پھر ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولا ''درخت' تنے' پتے' جھاڑیاں' چھتنار' پگڈنڈی سب کچھ وہی تھا لیکن اس کے باوجود یہ محسوس ہوتا تھا گویا یہ اور کوئی جنگل ہے۔ میں حیرت زدہ ٹھٹھک کر رک گیا۔ نظریں دوڑائیں دماغ پر زور دیا' حواس سے کام لیا۔ تب یہ احساس ہوا کہ جنگل میں کسی شاخ پر بھی کسی پرندے کا گھونسلہ نہ تھا۔ پرندوں کی اڑان اور چہچہاہٹ سے خالی جنگل بھوت بن محسوس ہو رہا تھا۔ یا مظہر العجائب! یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں۔ جنگل کی رونق تو پرندوں سے ہے معصوم شوخ اور چہچہاتے پرندے۔ ان کے بغیر جنگل کیسا جنگل؟ سنسان درختوں کے جھنڈ میں شوکتی خاموشی تو جنگل نہیں بناتی؟...... ہے نا!''

اس کے لب کپکپا کر خاموش ہو گئے۔ کچھ دیر تک وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے سب کو دیکھتا رہا' سب خاموش' ساکت اس پر نظریں جمائے تھے وہ پھر بولا۔

''ابھی میں حیرت زدہ کھڑا ہی تھا کہ اچانک مجھے یہ بھی احساس ہوا کہ جنگل کے کسی پودے' جھاڑی اور درخت پر پھول بھی نہ تھے۔ گلاب کا پودا صرف کانٹے اگا رہا تھا۔ عشق پیچاں کی بیل درخت سے مردہ سانپ کی مانند لٹک رہی تھی اور مولسری کا درخت صرف مردہ پتوں کا ڈھیر۔''

وہ پھر خاموش ہو گیا۔ گویا منظر کی وحشت نے غلبہ پا لیا ہو' سب مشوش اسے دیکھ رہے تھے۔ کان جو سن رہے تھے ذہن اس کا مفہوم سمجھنے سے قاصر تھا۔ یقیناً کسی چھل پائی نے اس پر قبضہ جما لیا تھا اور اب یہ سودائی واہی تباہی بک رہا تھا مگر اسے کسی نے ٹوکا بھی نہیں۔

''میں گویا حیرت کی دلدل میں پھنس چکا تھا اور اسی کے ساتھ ہی خوف بے پناہ خوف۔ بے اماں خوف۔ ساتھیو! یوں سمجھو کہ میں نے اپنے خوف کو پہلی مرتبہ مجسم دیکھا۔ گویا وہ میرے سامنے کھڑا ہو' دانت نکوس کر میرا مضحکہ اڑا رہا ہو۔ میں نے بھاگنا چاہا مگر میں بھاگنے کے قابل نہ رہا تھا۔''

اس نے جھرجھری لی اور خاموش ہو گیا! سب مانند تصویر چپ!

ساتھیو! تم جانتے ہو کہ میں بزدل نہیں! میں نے خود کو سنبھالا۔ خوف پر قابو پایا اور آگے بڑھنے کو قدم اُٹھایا تو میں نے اسے سامنے پایا۔''

''کسے......؟'' لاتعداد حلقوں سے ایک ہی لفظ نکلا۔

''اسے!'' اس نے جھرجھری لی ''اسی کو!'' اس نے گویا انہیں سمجھانے کی کوشش کی ''وہی...... وہی...... جس نے اس بستی کی زندگی سلب کر لی ہے۔''

متعدد سینوں میں رکی سانسیں بیک وقت خارج ہوئیں۔

''عجیب کیفیت تھی' وہ گویا سامنے تھا اور نہیں بھی۔ اتنا قریب کہ میں اس کے وجود سے پھوٹتے تعفن کو گویا چھو کر محسوس کر سکتا تھا اور ساتھ ہی اتنا دور بھی گویا میلوں کے فاصلہ سے اس کا ہیولیٰ نظر آ رہا ہو۔''

اب جو اس کے منہ سے کٹورا لگایا تو بند دانتوں سے پانی ہونٹوں کے کناروں سے بہہ نکلا۔

یہ پہلا واقعہ آخری نہ ثابت ہوا کہ اس کے بعد متعدد افراد نے اسے دیکھا مگر الگ روپ میں اور دہشت کی الگ تصویر میں___ اپنا خوف' اپنے حواس' اپنی آنکھیں اور ان سے بننے والا وجود۔ کسی نے پہاڑ کی کھوہ میں اژدہے کی مانند اسے آگ اگلتے پایا' کسی نے بھیانک وجود کو انگارے چباتے دیکھا۔ کسی نے کھنڈر میں اس کے آٹھ ہاتھ دیکھے' کسی نے چار گردنیں' کسی نے گورستان میں صرف اس کے لمبے لمبے دانت دیکھے جن سے مردہ گوشت کے ریشے لٹک رہے تھے تو کسی نے ویرانہ میں اس کی طشتریوں جیسی بڑی بڑی آنکھوں میں اپنی تصویر دیکھی۔ ایک کسان نے اس کے وجود کو اپنے کھیتوں پر معلق پایا جس کے زیر اثر لہلہاتی فصلیں سنپولوں میں تبدیل ہو گئیں۔ مرغزار میں چرواہے نے دیکھا کہ ہری اور ملائم دوب پر نادیدہ قدموں کے آتشیں نشانات ابھر رہے ہیں...... باغبان کی پھولوں بھری ٹوکری میں سے کلبلاتے بچھو نکلے اور خوش رنگ پھولوں سے مالن نے جو مالا بنائی وہ کن کھجوروں کی مالا میں تبدیل ہو گئی۔ گوالے نے دودھ دوہنے کے لئے گائے کے تھن دبائے تو ان میں سے خون کی دھاریں بہہ نکلیں۔

نادیدہ کا خوف آسیب کی مانند بستی پر مسلط تھا۔ ہر روز نیا حادثہ‘ ہر روز نیا خوف‘ ہر شخص کا اپنا مشاہدہ اور ذاتی عذاب۔ کسی کے خوف کا کوئی راز دار بننے کو تیار نہیں ہر متنفس اپنے خوف کے قفس کا اسیر!

(2)

وہ تین دوست تھے۔ خواب دیکھنے والا شاعر‘ نغموں کے پھول کھلانے والا مغنی اور رنگوں کا دلدادہ مصور‘ یہ تینوں اپنی تخلیقات کے طلسمی حصار میں محفوظ تھے کہ لفظ‘ سُر اور رنگ ان کے لئے اسمِ اعظم تھا۔ اس لئے تمام بستی میں سے صرف یہی تین اس عفریت کی دہشت سے آزاد تھے کہ اُن کے پاس تو عفریت کو دیکھنے والی آنکھ ہی نہ تھی۔ شاعر خوابوں کو الفاظ کا جامہ پہنانے میں محو‘ مغنی تتلی جیسے گریز پا سُروں کو گرفت میں لانے میں منہمک اور مصور نظر افروز رنگوں کی تلاش میں سرگرداں۔ ان کے پاس تو خوف زدہ ہونے کے لئے وقت ہی نہ تھا۔ جہاں خوبصورت خیالات کی نازک پریاں اترتی ہوں وہاں عفریت کے خوف کی رسائی کیسے ہو سکتی تھی؟ جن کانوں میں مسلسل نغمات گونجتے ہوں وہ عفریت کی پھنکار کے لئے بہرے ثابت ہوئے اور جن آنکھوں میں خوش منظر شبیہیں ہوں ان میں ندیدہ کا سراپا کیسے سماتا؟ لہٰذا یہ تینوں خوف بھری بستی میں سکون اور طمانیت سے اپنی تخلیقات کو اپنے وجود کا ہمزاد بنانے میں مگن تھے مگر اتنے مگن بھی نہیں کہ اپنے بھائیوں دوستوں اور پڑوسیوں کو نادیدہ خوف کے چنگل میں بلبلاتے دیکھ کر لاتعلق رہتے۔

تینوں سر جوڑ کر بیٹھے۔

”ہمیں کچھ کرنا چاہیے۔“

انہوں نے مصمم ارادہ کیا۔

”بستی کو اس نادیدہ کے خوف سے نجات دلانی چاہیے۔“

تینوں نے عزمِ سفر کیا۔

وہ گوالے‘ باغبان‘ مالن‘ کسان سب سے ملے مگر کوئی بھی واضح طور پر دیکھنے کے باوجود بھی نادیدہ کی نشاندہی نہ کر سکا۔ سبھی اپنے اپنے خوف کی مٹھی میں بند مکوڑے کی مانند تھے کہ ان کے لئے سب سے بڑی حقیقت ان کا خوف ہی تھا۔ تینوں نے ایک ایک کھونٹ

سنبھالی اور آغازِ سفر کیا۔ چوتھی کھونٹ سمندر تھا وہ اپنی دھن میں مگن اور جستجو کے نشہ میں سرشار ہرج مرج کھینچتے منزلیں سر کرتے رہے۔ پچھل پائیوں نے راہ روکی‘ چھلاووں نے ڈرایا‘ بھوتوں نے پریشان کیا مگر یہ ہراساں نہ ہوئے...... شاعر نے الفاظ کے منتروں سے‘ مغنی نے نغمات سے خالی فضا اور مصور نے رنگوں سے محروم پھولوں کی مدد سے نادیدہ کے ٹھکانے کا سراغ لگا لیا اور تینوں ایک سوختہ کوہ کے سامنے آن ملے کہ یہی منزل تھی!

سامنے غار کا دہانہ تھا۔ یقیناً نادیدہ کو اسی غار میں ہونا چاہیے‘ تینوں عزم صمیم کی تصویر بنے الفاظ کے ہتھیار سجائے‘ سروں کی چھایا میں رنگوں کی ڈھال سنبھالے‘ آگے بڑھے‘ اور آگے بڑھے اور بھی آگے بڑھے!

غار کا دہانہ سامنے تھا جس سے تاریکی گویا باہر کو امڈی چلی آ رہی تھی مگر اندر قدم رکھتے ہی گویا یدِ بیضا سے تاریکی چھٹ گئی۔ وہ حیران کھڑے تھے اندر تو کچھ بھی نہ تھا‘ نہ دیو‘ نہ آدم خور‘ نہ پچھل پائیاں‘ نہ عفریت‘ نہ اژدہا نہ اگیا بیتال...... کچھ بھی تو نہ تھا۔ بجز اس جالے کے جس کے دل میں مردہ مکڑی جھول رہی تھی۔

O.....O.....O

سب کہاں؟

وہ جیسے پتھر بنا دیکھ رہا تھا' چھپکلی' مکڑا اور پتنگا تقریباً یکساں فاصلے پر تھا۔ اپنے زرد پیٹ پر رینگتی چھپکلی محتاط ہو کر یوں رُکی گویا چپک کر دیوار میں سما جائے گی۔ دوسری جانب مکڑا اپنی چھوٹی چھوٹی گول آنکھوں کو پتنگے پر یوں مرکوز کیے تھا گویا تمام جسم آنکھ میں تبدیل ہو گیا ہو اور ان دونوں کی نیتوں سے بے پروا پتنگا تھا جو باہر سڑک پر سے آتی روشنی کے دائرے میں گویا تھکا ہارا بیٹھا سستا رہا تھا...... اور وہ کہ تخلیق کار تھا دم بخود دیکھ رہا تھا' اس کی ایک ہی آرزو تھی کہ وہ بھی اپنے ماحول کی اسٹیج پر چھپکلی' مکڑے اور پتنگے کا زندہ ناٹک پیش کرے مگر جب بھی قلم اُٹھایا۔ دھڑکتے دل نے ڈرایا...... لہٰذا وہ محض ایک رومان نگار ہی رہا کہ یوں شہرت اور دولت کے علاوہ جھوٹ کی عافیت بھی تھی۔ وہ بے حد تناؤ کے عالم میں دیکھ رہا تھا۔

ان میں سے میں کون ہوں؟ میں چھپکلی نہیں ہو سکتا کہ مجھے اس سے بے حد گھن آتی ہے۔ میں مکڑا نہیں ہو سکتا کہ جال بنانے کے فن سے نا آشنا ہوں' اس نے جُھرجُھری لے کر سوچا تو کیا انسان ہوتے ہوئے بھی میں پتنگے کی زندگی گزارنے پر مجبور ہوں۔ وہ خود کو بڑی بڑی گول آنکھوں اور کراہت بھرے زرد رنگ کی چھپکلیوں کے نرغے میں محسوس کر رہا تھا۔ بھاگے تو کہاں جائے کہ دوسری جانب بڑے بڑے مکڑے اپنی چھ ٹانگوں پر کھڑے راستہ روکے تھے اور ان سب کے عقب میں لفظوں کا جال!

وہ بستر پر بیٹھ گیا...... جی چاہا کہ اُٹھ کر پتنگے کو اڑا دے پھر سوچا کہ کیا ایک چھپکلی اور ایک مکڑے سے بچا کر وہ لاتعداد پتنگوں کی حفاظت کر سکتا ہے؟ نہیں تو پھر اس ایک

عاقبت نااندیش پتنگے کو بچانے سے کیا حاصل؟ ویسے بھی اس منظر سے وہ ایک کجرو قسم کا اعصابی تناؤ محسوس کر رہا تھا!

چھپکلی پیٹ دبائے اور سرک گئی تھی۔ اس کی گول آنکھیں پتنگے پر جمی تھی۔ ادھر مکڑا بھی غافل نہ تھا اور اپنی چھ ٹانگوں پر ایستادہ بے حد مستعد تھا' وہ اُس تر نوالے کو گرفت کے قریب محسوس کر کے ہونٹوں پر زبان پھیر رہا تھا پھر وہ یہ سوچ کر ہنسا' بھلا مکڑے کو انسانوں کی طرح ہونٹوں پر زبان پھیرنے کی کیا ضرورت ہے۔

اور پھر پلک جھپکنے سے بھی کم عرصہ میں کھیل ختم' جس لمحے مکڑے نے پتنگے کو دبوچا عین اُسی لمحہ چھپکلی نے جست لگائی' اپنا مکروہ منہ کھولا' پتلی زبان لہرائی اور اگلے ہی لمحہ مکڑا مع پتنگے اس کے منہ میں تھا ایک ثانیہ کو مکڑے کی مہین ٹانگیں چھپکلی کے منہ سے باہر بے چینی سے ہلتی دکھائی دیں اور اس کے بعد وہ بھی منہ میں سمٹ گئیں۔ چھپکلی اندھیرے میں نکل گئی صرف کونے میں مکڑے کا جالا رہ گیا۔

سینے میں رُکی سانس خارج ہوئی تو اُسے رات کی خاموشی کا احساس ہوا۔ ایسی خاموشی جس میں رات کی چاپ سُنی جا سکے' اس کے جسم میں لرزش تھی' حلق سوکھ رہا تھا۔ پانی پینے کو اُٹھنے والا ہی تھا کہ جسم ساکت ہو گیا۔ عضلات میں اکڑاؤ پیدا ہو گیا' معدہ میں پھڑپھڑاہٹ محسوس کی...... تمام جسم کان میں تبدیل ہو چکا تھا۔

لاتعداد گزری راتوں کی مانند یہ اس کا وہم نہ تھا۔ واقعی نیچے ٹرک رکا تھا' عین اس کی عمارت کے نیچے جس کے چار حصے تھے اور جس کے لاتعداد کمروں میں اگرچہ بھانت بھانت کے کنبے بستے تھے مگر وہ سب ایک ہی ڈور سے بندھے تھے۔

ہر رات بستر پر لیٹتا تو لگتا گویا نیچے ٹرک رُکا ہے اور بھاری بھاری بوٹوں کی آوازیں جیسے اعصاب کچل ڈالتیں مگر نہیں یہ سب ڈرپوک دل کے اندیشے ہوتے یقیناً اس کا معدہ خراب ہے' شاید اُسے السر ہے۔ ورنہ یقیناً یہ معدہ کی گیس کا کرشمہ ہے جو وہ یوں اندیشوں کی دلدل میں پھنسا ہے۔ اندیشے بے سروپا سہی مگر انہوں نے اس کی نیند اڑا دی اور وہ مستقلاً بے خوابی کا مریض بن کر رہ گیا۔ شاید عام حالات میں وہ اس بے خوابی کو بھی تعمیری مقاصد کے لئے استعمال کر کے لکھتا پڑھتا رہتا مگر اب تو وہ یہ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ مبادا پڑوسی سوچیں کہ یہ ہر رات

کمرہ میں روشنی کرکے کیا کرتا رہتا ہے۔ چنانچہ اندھیرے کمرے میں لیٹا رہتا اور تاریکی اس کی کتابوں کی الماری لکھنے کی میز اور قلم سب کچھ نگل لیتی ___ یوں کہ مانوس کمرہ اجنبی بن جاتا۔ صرف سڑک پر سے آتی ناکافی روشنی کے ملگجے دائرے میں دیوار کا حصہ نمایاں رہتا۔

سڑک پر زور زور سے بولنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ الفاظ سمجھ میں نہ آ رہے تھے مگر لہجہ کی خشونت بذاتِ خود مفہوم کی حامل تھی۔ خاموش سڑک بوٹوں اور آواز کی خشونت سے گونج رہی تھی' بوٹ ادھر جا رہے تھے بوٹ اُدھر جا رہے تھے۔

وہ سانس روکے تھا (بوٹ اسی عمارت کے سامنے رُکے تھے) اس میں اب کوئی شبہ نہ تھا۔ وہ خشونت بھری آواز پھر گونجی (یقیناً بوٹ اسی عمارت کے مرکزی دروازہ پر رُکے تھے) اس کا ماتھا پسینہ میں بھیگ گیا (بوٹ سیڑھیاں چڑھتے آ رہے تھے۔ سیڑھیاں خشونت بھری آواز سے گونج رہی تھیں) ریڑھ کی ہڈی سے سرد لہریں سارے جسم میں پھیل رہی تھیں (بوٹ اس کی راہداری میں آ رہے تھے) خاموش راہداری جیسے ان بوٹوں کے شور سے بھر گئی یہ کتنے بوٹ تھے کہ تمام عمارت ان سے گونج رہی تھی؟ یہ کتنے بوٹ تھے کہ سب کچھ ان کی بازگشت محسوس ہوتا تھا؟ لرزاں جسم لکڑی کے تختہ میں تبدیل ہو چکا تھا (بوٹ قریب) کان کے پردے پھٹنے کو تھے (بوٹ قریب تر) آنکھوں کی پُتلیاں پھیل گئیں (بوٹ قریب ترین) دل دھڑکن بھولا (بوٹ اس کے دروازے پر رُک گئے تھے)

وہ ایک ثانیہ تھا کہ ایک صدی اسے اس کا ادراک نہ ہو سکا۔ وہ چند لمحات کہ جب بوٹ اس کے دروازے پر رُکے رہے ان میں ہر سانس کے ساتھ وہ کتنی موتیں مرا تھا' کوئی زندہ انسان اس کا تجربہ نہیں کر سکتا۔ شاید وہ بھی نہیں۔

بوٹ آگے بڑھ گئے اور تب پڑوسی کے دروازے کے سامنے پُرخشونت آواز گونجی اور بھاری بوٹوں کی ٹھوکر نے گویا تختوں کو پیچوں سے اُکھاڑ دیا اور پھر ایک گھٹی گھٹی چیخ!

پھیلی پُتلیاں ٹھیک ہو چکی تھیں' دل کی دھڑکن معمول پر تھی۔ سکون اب جسم میں گرم لہر بن کر دوڑ رہا تھا' جسم پر ہاتھ پھیرا تو تنے عضلات کو نرم ہوتے پایا۔ جب پانی پینے کے لئے ہلا تب احساس ہوا کہ وہ تو اپنے بنائے ہوئے پانی میں شرابور تھا۔

○.....○.....○